شمارہ ۹، ۲۰۲۰ء

نمود

طلبہ کا سالانہ ادبی رسالہ

گرمانی مرکزِ زبان و ادب

LUMS
A Not-for-Profit University

نمود

شمارہ ۹، ۲۰۲۰ء

طلبہ کا سالانہ ادبی رسالہ

مدیر: راز احتشام

مدیر منتظم: محمد علی

نائب مدیران: آمنہ شکیل، تسنیم کوثر

گرمانی مرکزِ زبان و ادب | LUMS A Not-for-Profit University

لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز

فہرست

اداریہ

مضامین

زندانی اردو شاعری، اہم شعرا، موضوعات، ادبی جائزہ	اذان بن زاہد	(طالب علم لمز)	۹
تقسیمِ ہند، پنجابی کہانیوں کے تناظر میں (تین پنجابی کہانیوں کے حوالے سے)	انیقہ خالد	(طالبہ لمز)	۱۷
اقبال کی رومانوی شاعری، پس منظر اور تجزیہ	دانش خان	(طالب علم لمز)	۲۴
ناصر کاظمی کا تہذیبی ناسٹیلجیا	محمد علی	(طالب علم لمز)	۳۰
کراچی کے بارے میں سید محمد جعفری کی مزاحیہ شاعری	فاطمہ وسیم	(طالبہ لمز)	۴۰
جون ایلیا: فکر و فن	محمد علی	(طالب علم لمز)	۴۸
نسرین انجم بھٹی	نیہا عابد	(طالبہ لمز)	۶۱
محمد اظہار الحق، موضوعات اور ادبی خصوصیات	محمد احمر	(طالب علم لمز)	۶۹
ادریس بابر کی شاعری کا فنی و فکری تجزیہ	محمد علی وسان	(طالب علم لمز)	۷۸

افسانے/کہانیاں

خار	شیخ خبیب احمد	(طالب علم لمز)	۸۷
زلفوں کا سَحر	مومنہ افضل	(طالبہ لمز)	۹۱
لنڈے کا کوٹ	آرزو مہتاب	(طالبہ لمز)	۹۳

پری	شیریں عباس	(طالبہ لمز)	۹۷
عزت کی کہانی	حسان شعوانہ	(طالب علم لمز)	۱۰۱
واپسی	ایمن خضر	(طالبہ لمز)	۱۰۴
یادیں	بریرہ گلزار	(طالبہ لمز)	۱۰۶
ادھورا سچ	آمنہ احمد	(طالبہ لمز)	۱۰۸
اٹلانٹس	سیدہ صدف یاسمین	(طالبہ لمز)	۱۱۲
شناخت	محمد حارث ارشد	(طالب علم لمز)	۱۱۵
بھوک	حجاب فاطمہ	(طالبہ لمز)	۱۱۹
رزق	حسان شعوانہ	(طالب علم لمز)	۱۲۶
سنیپ سٹریک	وسیم عباس	(طالب علم لمز)	۱۳۰
پڑھائی	وسیم عباس	(طالب علم لمز)	۱۳۳
لیڈر باجی اور عاصمہ: راشن کی کہانی	شہر بانو	(طالبہ لمز)	۱۳۹
نسیم کی لاش	محبوب علی	(طالب علم لمز)	۱۴۱
ذات	صبیح احمد	(طالب علم لمز)	۱۴۴
تھوڑا سا	آمنہ ذوالقدر	(طالبہ لمز)	۱۴۸
کایا پلٹ	فراز حسین	(طالب علم لمز)	۱۵۲
ماسٹر مائنڈ	محمد حارث	(طالب علم لمز)	۱۵۶
سچّا پیار	محمد عبداللہ ظفر	(طالب علم لمز)	۱۵۸
اے کاش۔۔۔	رمیزہ رضوی	(طالبہ لمز)	۱۶۲
راضی	مبشرہ اشرف	(طالبہ لمز)	۱۶۶
پہلی نظر کا پیار	فرحان سلیم	(ریسرچ اسسٹنٹ)	۱۶۸

نظمیں

گلوبل وارمنگ	راز احتشام	(طالب علم لمز)	۱۷۱
میں خواب لکھتا ہوں	راز احتشام	(طالب علم لمز)	۱۷۳

غزلیں

مرض اب تو اک اور سر اٹھانے لگا	اسامہ رضوان	(طالب علم لمز)	۱۷۶
لوٹ آئے ہیں خاک چھان کے بھی	راز احتشام	(طالب علم لمز)	۱۷۷
جو کوہ قافِ غزل کی پری نہ لے جائے	راز احتشام	(طالب علم لمز)	۱۷۸
کچھ خوابوں کا بہکایا ہوا ہوں	روحان حسین	(طالب علم لمز)	۱۷۹
گویا نہ ہوئے وہ جو چند دنوں سے	اسامہ رضوان	(طالب علم لمز)	۱۸۰

رپورتاژ

حلقۂ دانش اور احمد بلال اعوان بزمِ ادب تقاریب	زاہد حسن	(ریسرچ ایسوسی ایٹ)	۱۸۱

اداریہ

اربوں کہکشاؤں کے جمگھٹے میں زندگی سے بھرے ایک ننھے سیارے پہ وبا کے دن ہیں، بیم و رجا اور غیر یقینیت کی دھند میں لپٹے ہوئے اس سیارے کے مکیں ایک نا قابلِ فراموش واقع کے عین درمیان سے گزر رہے ہیں۔ اول اول تو اس آفت سے گلیاں ویران ہوئیں، بازاروں میں ہُو کا عالم ہوا اور سینوں میں اس نادیدہ عفریت کی ہیبت بیٹھ گئی۔ مگر رفتہ رفتہ انسانوں نے اس کے ساتھ گزر بسر کرنا سیکھ لیا ہے، کاروبارِ زندگی بحال ہو رہا ہے البتہ خطرہ ابھی ٹلا نہیں اور یہ تلوار سبھی کے سر پہ تا حال لٹک رہی ہے!

یہ تمہید یوں بھی ضروری ہے کہ ان مشکل ترین حالات کے باوجود نمود کا نواں شمارہ شائع ہونا بہار کا جھونکا ثابت ہوگا۔ نمود اس بار اپنے دامن میں اقبال، ناصر کاظمی اور جون ایلیا ایسے جید شعرا کی فنی مہارت پہ تحقیقی نقطۂ نگاہ رکھتے ہوئے مضامین کے ساتھ ساتھ دل کو موہ لینے والی اور احساس کی تاریں چھیڑنے والی کہانیوں سے مزین ہے۔ ''عزت کی کہانی'' اور ''نسیم کی لاش'' سمیت دیگر افسانے کئی سماجی اور معاشرتی تضادات کو اجاگر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حصہ غزل اور نظم نوجوان شعرا کی ندرت سے بھرپور شاعری کا گل دستہ ہے۔ آخر میں ''حلقۂ دانش'' اور ''احمد بلال اعوان بزمِ ادب'' کی تقاریب پہ سیر حاصل رپورتاژ بھی لمز کی ادبی سرگرمیوں کی غماز ہیں۔

اس شمارے کی تحریروں میں لمز کے طلبہ کی بھرپور شمولیت سے یہ بات اظہر من الشّمس ہوگئی ہے کہ ٹیکنالوجی کے اس جدید عہد میں بھی لمز کے طلبہ قلم اور جمالیات سے رشتہ استوار کیے ہوئے اپنے سماجی و معاشرتی مسائل سے بے خبر نہیں ہیں۔

ان تمام طلبہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی تحاریر نمود کے لیے بھیجیں کہ اس غیر یقینی صورتحال میں بھی انہوں نے قلم سے رشتہ برقرار رکھا، اس کے بعد میں اپنی ادارتی ٹیم کے اراکین محمد علی، تسنیم کوثر اور آمنہ شکیل کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی شبانہ روز محنت سے نمود کی تکمیل ممکن ہوئی، مزید برآں اس شمارے کی ترتیب و تدوین نہایت عمدہ شاعر اور استاد ڈاکٹر معین نظامی، پروفیسر بلال تنویر اور زاہد حسن صاحب کی محبت اور شفقت کے بغیر ہرگز ممکن نہ ہوتی، مالکِ حرف ان کا سایہ تادیر نمود اور ہم پہ قائم رکھے! میں بالخصوص متشکر ہوں گرمانی مرکز میں ریسرچ اسسٹنٹ جناب فرحان سلیم کا، جنھوں نے متن کی کمپوزنگ سے سرورق کی تیاری تک، جاں فشانی اور خوش اسلوبی سے اپنا کردار ادا کیا۔

امید ہے یہ شمارہ آپ کے ذوق اور ادب دوستی کو جلا بخشے گا۔ آپ کو یہ شمارہ اور اس کے مندرجات کیسے لگے اس بارے میں ہمیں ضرور لکھیے کہ نمود کا دامن ہر طرح کے تجزیے، رائے اور تنقید کے لیے کشادہ ہے۔ دعا ہے مالکِ نطق و بیان اس کاوش کو قبول فرمائے آمین!

راز احتشام

اذان بن زاہد

اردو شاعری اور شعریات

زندانی اردو شاعری، اہم شعرا، موضوعات، ادبی جائزہ

دیگر عظیم اور وسیع زبانوں کی طرح اردو بھی بہت سی اصنافِ سخن سے مالا مال ہے بلکہ ہر مرکزی صنف کے تحت اس کی مختلف اقسام، ذیلی اصناف اور ان میں انفرادیت نے اس کو آباد رکھا ہے۔ اس مضمون میں (جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے) میرا مقصد اردو ادب کے ایک ذیلی مگر اہم گوشہ 'زندانی اردو شاعری' یا 'حبسیات' کا تعارف، اس کے اہم شعرا اور ان کے موضوعات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ہے۔

زندانی ادب

زندانی شاعری سے پہلے اگر زندانی ادب کو سمجھ لیا جائے تو مضمون کے اگلے حصے کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ زندانی ادب سے مراد وہ تحریریں ہیں جنھیں ان کے مصنفین نے دوران قید یا قید و بند سے رہائی کے بعد قلم بند کیا ہو۔ یہاں اس بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ اسیری کے دوران یا رہائی کے بعد کی کن تحریروں پر اس کا اطلاق ہوگا اور کون سی اس کے دائرے سے خارج ہوں گی۔ چناں چہ اس بارے میں تحقیق کے بعد محمد سعید الرحمٰن سعدی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ رہائی کے بعد کی تو صرف وہی تحریریں اس زمرے میں شامل ہو سکیں گی، جن کا تعلق رودادِ اسیری، داستانِ قید و بند، احوالِ زنداں اور جیل کے کوائف اور روزنامچوں سے نظم یا نثر کی زبان میں ہو، اور جہاں تک بات ہے ان تحریروں کی جو ایامِ قید میں قلم بند کی گئی ہوں تو وقت کے ساتھ ساتھ اس دائرے میں وسعت آتی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اب ہر وہ تحریر اس صنف میں شامل سمجھی جاتی ہے، جو زنداں میں رقم کی گئی ہوں، خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں، اس کا تعلق خالص مذہب سے ہو یا ادبی مضامین سے، اس کا موضوع تدریسی و علمی ہو یا فکری و اصلاحی، تاریخ و

سیاست سے اس کا رشتہ ہو یا تحقیق وتنقید سے۔ خلاصہ یہ کہ علم وادب کی تمام مرکزی وذیلی شاخیں اس کے دائرہ میں شامل ہیں، بس شرط یہ ہے کہ یہ ادب زندان میں لکھا گیا ہو یا زنداں میں گزرے ہوئے حالات کے بارے میں ہو۔

زندانی شاعری

اگر زندانی ادب میں سے صرف شاعری کا انتخاب کیا جائے تو یہ زندانی شاعری کہلاتی ہے۔ مندرجہ بالا شرائط شاعری پر بھی لاگو ہوتی ہیں۔ چوں کہ اس مضمون کا مرکزی موضوع زندانی شاعری ہے چناں چہ زندانی شاعری کو سمجھنے کے لیے خاص طور پر ان دو اہم پہلوؤں کو سمجھنا بھی ضروری ہے جو زندانی شاعری میں نمایاں ہیں:

- سماجی پہلو
- نفسیاتی پہلو

سماجی پہلو

زندانی شاعری میں سماجی پہلو اس بات پر منحصر ہے کہ شاعر کو کس جرم کے تحت زندان میں بھیجا گیا ہے؟ وہ کون سے مسائل ہیں جنھوں نے شاعر کو موجودہ سماجی نظام سے بغاوت کے لیے آمادہ کیا ہے؟ وہ کہاں تک اس سلسلے میں آگے جا سکتا ہے؟ اس کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ انسانی اور اخلاقی قدریں اس کی نظر میں ہیں یا نہیں؟ یہ تمام باتیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ بعض دوسرے سماجی محرکات پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ زندانی زندگی بسر کر کے شاعر ایک طرح کی قربانی دیتا ہے۔ اس کے لیے کسی بھی شاعر کی زندانی شاعری کو سمجھنے کے لیے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کون سے سیاسی یا سماجی محرکات ہیں جو اس شاعر یا ادیب پر اثر انداز ہوتے ہیں، اگر سیاسی محرکات ہیں تو ان کی جہت اور سمت کیا ہے؟ ان کا رجحان ترقی کی طرف ہے یا نہیں؟ خود سماج کی اجتماعی زندگی کی حرکیات کا المیہ کیا ہے؟

نفسیاتی پہلو

جیل خانے کی زندگی ایک عجیب زندگی ہے، اس میں قیدیوں کا رابطہ سماج سے کٹ جاتا ہے، یہاں زندان کی تنگی، جیل کے مسائل، بے وقت روٹی، اجنبی چہرے اور اسیری ہے۔ یہ صورتِ حال ذہنی اور نفسیاتی طور پر زندانیوں

پر جو اثرات ڈالتی ہے، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس سے عدم توازن کے امکانات کی موجودگی کا پتا چل جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں انسان کیسی کیسی پناہ گاہیں ڈھونڈتا ہے؟ کیسے دوست بناتا ہے؟ اپنا وقت کیسے گزرتا ہے؟ کن لوگوں کو یاد کرتا ہے؟ یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ایسے ماحول میں تنہائی پسندی، دنیا سے بےزاری اور خودکشی جیسے مریضانہ جذبات بھی انسان پر غلبہ پا سکتے ہیں۔

اس نقطۂ نظر سے یہ بات بھی اہم ہے کہ زندانی شاعری کے لیے کن موضوعات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ موضوعات کا انتخاب اور شاعری کی پختگی سے شاعر کی ذہنی ساخت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لیے زندانی ادب کا نفسیاتی پہلو بھی کچھ کم اہم نہیں۔

موضوعات اور اہم شعرا

اردو میں جیل سے لکھی جانے والی شاعری بہت مقبول رہی ہے اور انھیں قارئین نے دل چسپی سے پڑھا بھی ہے۔ ان تحریروں میں سیاسی احتجاج، مزاحمت ناانصافیوں کی نشان دہی ہونے کے ساتھ ساتھ بہتر معاشرے کے خواب بکھرے ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ہم غالب (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء) سے شروع کرتے ہیں، جنھیں ۱۸۴۷ء میں جوئے کا اڈا چلانے کے الزام میں چھ ماہ کے لیے سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔ بعد میں انھیں تین مہینے سزا کاٹنے پر رہائی ملی۔ قید کے دوران غالب نے ۱۸۴ اشعار پر مشتمل ایک فارسی ترکیب بند لکھا۔ اس عرصے میں انھوں نے کم ازکم ایک اردو شعر بھی لکھا جس کا محققین اکثر ذکر کرتے ہیں۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر (۱۷۷۵ء۔ ۱۸۶۲ء) کو ۱۸۵۷ء میں گرفتار کیا گیا، جب انھوں نے اپنے ملک اور لوگوں کو غیر ملکی قوتوں سے بچانے کی کوشش کی۔ ان کی زندانی شاعری کا ذکر آگے آئے گا۔

اس کے بعد برطانوی حکام کی جانب سے بار بار قید کیے جانے کی وجہ سے ظفر علی خان (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۶ء) نے کئی نظمیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی لکھیں۔ ان کا مجموعہ کلام حبسیات مکمل طور پر جیل میں لکھا گیا۔ ان کے بعد حسرت موہانی کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ حسرت موہانی (۱۸۷۸ء۔۱۹۵۱ء) کا جیل میں لکھا ہوا یہ شعر اب بھی اکثر پڑھا اور سنا جاتا ہے:

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

ان کے علاوہ شورش کاشمیری (۱۹۱۷ء۔۱۹۷۵ء)، علامہ انور صابری (۱۹۰۱ء۔۱۹۸۵ء)، سردار جعفری (۱۹۱۳ء۔۲۰۰۰ء)، حفیظ میرٹھی (۱۹۲۲ء۔۲۰۰۰ء)، فراق گورکھپوری (۱۸۹۶ء۔۱۹۸۲ء)،حبیب جالب (۱۹۲۸ء۔۱۹۹۳ء)، احمد فراز (۱۹۳۱ء۔۲۰۰۸ء)، اسرار جامعی (۱۹۳۷ء۔۲۰۲۰ء) اور دیگر انقلابی شعرا کے نام اہم ہیں۔ ان حضرات کے مجموعہ ہائے کلام اور کلیات کا بیش تر حصہ پسِ دیوارِ زنداں ہی تخلیق ہوا۔ یہاں فیض (۱۹۱۱ء۔ ۱۹۸۴ء) کا ذکر نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی، جن کے دو اہم مجموعوں کا سبب ہی قید و بند کے ساڑھے تین سال بنے، یعنی دست صبا اور زنداں نامہ جو ان کے کلیات کے اہم حصے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶ء۔۲۰۰۶ء)، علی سردار جعفری (۱۹۱۳ء۔۲۰۰۰ء) اور نعیم صدیقی (۱۹۱۳ء۔۲۰۰۲ء) نے بھی اپنی کئی نظمیں جیل میں لکھیں۔

مندرجہ ذیل شعرا کی زندانی کیفیت اور زندانی شاعری پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے:

- بہادر شاہ ظفر (۱۷۵۷ء۔ ۱۸۶۲ء)
- واجد علی شاہ (۱۸۲۲ء۔۱۸۸۷ء)
- فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء۔ ۱۹۸۴ء)

بہادر شاہ ظفر (۱۷۵۷ء۔ ۱۸۶۲ء)

بہادر شاہ ظفر کا نام ابوظفر سراج الدین محمد تھا۔ ان کی ولادت اکبر شاہ ثانی کے زمانۂ ولی عہدی میں ۱۴ اکتوبر ۱۷۵۷ء کو ہوئی۔ ابوظفر تاریخی نام ہے۔ اسی مطابقت سے انھوں نے اپنا تخلص ظفر رکھا۔ چوں کہ بہادر شاہ کے جدِ امجد اورنگ زیب کے بیٹے کا لقب بھی بہادر شاہ تھا لہٰذا وہ بہادر شاہ ثانی کہلائے۔ ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد بہادر شاہ کی تاج پوشی ہوئی۔

بہادر شاہ کی عمر بڑھنے کے ساتھ انگریزوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ دہلی کی بادشاہت ختم کر دی جائے گی اور لال قلعہ خالی کرا کے شہزادوں کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے گا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک کے بعد بہادر شاہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری

کے بعد مقدمہ کی سماعت کے دوران بہادر شاہ نے انتہائی بے چارگی کے دن گزارے۔

زندگی کے آخری ایام انھوں نے رنگون کے قید خانے میں گزارے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظفر کی پوری زندگی ایک طرح کی روحانی کش مکش اور ذہنی جلا وطنی میں گزری۔ ہڈیوں کو پگھلا دینے والا یہی غم ان کی زندانی شاعری کا اصل محرک ہے اور اس آگ میں جل کر انھوں نے جو شعر کہے ہیں وہ ہمارے سامنے ایک زبردست مثال ہیں۔

ہر نفس اس دامن مژگاں کی جنبش سے ظفر
اک شعلہ سا بھڑکا اور بھڑک کر رہ گیا

اسی طرح اس غزل میں قید کے اثرات بہ خوبی دیکھے جاسکتے ہیں:

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالم ناپائدار میں
کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دل داغ دار میں
کانٹوں کو مت نکال چمن سے او باغباں
یہ بھی گلوں کے ساتھ پلے ہیں بہار میں
بلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصل بہار میں
کتنا ہے بد نصیب ظفرؔ دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

مندرجہ ذیل غزل رنگون کی بے کسی و بے بسی کی یادگار ہے:

کون نگر میں آئے ہیں ہم کون نگر میں باسے ہیں
جائیں گے اب کون نگر کو من میں اب ہراسے ہیں

دیس نیا ہے بھیس نیا ہے ڈھنگ نیا ہے
کون آنند کرے ہے واں اور رہتے کون ادا سے ہیں
کیا کیا پہلو دیکھے ہیں ہم نے گلشن کی پھلواری میں
اب جو پھولے اس میں پھول کچھ اور ہی اس میں باسے ہیں
دنیا ہے یہ رین بسارا بیت گئی رہ گئی تھوڑی سی
ان سے کہ دو سو نہ جاویں نیند میں جو کہ نداسے ہیں

درج ذیل اشعار بھی اسیری کی یادگار کہے جاتے ہیں:

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ و دامنِ باد نے سرِشام ہی سے بجھا دیا
مجھے دفن کر چکو جس گھڑی تو یہ کہیو اس سے کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشقِ زار تھا تہِ خاک اس کو دَبا دیا

پسِ مرگ قبر پہ اے ظفرؔ کوئی فاتحہ بھی پڑھے کہاں
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اسے ٹھوکروں سے اڑا دیا

واجد علی شاہ (۱۸۲۲ء۔۱۸۸۵ء)

اودھ کے آخری سلطان، نواب واجد علی شاہ تھے جو ۱۸۴۷ء میں تخت نشین ہوئے۔ ایک سال بعد ہی ۱۸۵۷ء کا انقلاب برپا ہوا اور واجد علی شاہ کو فورٹ ولیم میں بہ حیثیت قیدی بھیج دیا گیا۔ وہاں انھیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، انھیں اپنی مثنوی حزن اختر میں بیان کیا ہے۔ واجد علی شاہ کی تصانیف میں یہ مثنوی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی اسیری کے حالات و واقعات لکھے ہیں۔ مثنوی کی تمہید میں اپنے قید خانے کی تکلیف اور نگران کرنل کو نیا کی تعریف بیان کی ہے۔ اس کے بعد مثنوی کے چند عنوانات یہ ہیں:

1۔ درصفت خود در قید خانہ

2۔ درصفت بیت الخلا ہائے قید خانہ

3۔ درصفت حشرات الارض

4۔ مشروع داستان ادا انتزاع سلطنت وہجر

5۔ گفتار درطلب منورالدولہ بہادر مرحوم

6۔ گفتار درآمدن علی نقی خان داردانہ شدن علی احمد خان

7۔ گفتار درشنیدن خبر بلوائے مفسداں واظاہر حال خود دشفا یافتن وجشن غسل صحت نمودن

8۔ گفتار درآمدن فوج انگریزی بنابر گرفتاری راقم التاریخ حاضر مانند

9۔ احوال تبدیل شدن زندان

مثنوی کے ان چند اشعار سے قید میں واجد علی شاہ کی ذہنی اور جذباتی حالت، بے چینی اور بے بسی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

مہینوں سے ہوں طالب وصل یار
نہ زنداں میں پہنچی نسیم بہار
نہ آتی ہے جاں نے نکلتا ہے دم
حجر ہو گئی رنج سے چشم نم
نہ تسکیں کو ہے پر تو آفتاب
تماشے کو آتا نہیں ماہتاب
ہو ابھی جو آتی ہے سہمگیں
نہ یاور نہ موض نہ کوئی قریں
رفیقوں نے چھوڑا اکیلا مجھے
سبھوں نے کنویں میں دھکیلا مجھے

فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء۔ ۱۹۸۴ء)

یہاں بیسویں صدی کے اہم ترین شعرا میں سے ایک، فیض احمد فیض کا ذکر مناسب ہوگا۔ آپ کا نام فیض احمد اور تخلص فیض تھا۔ ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو کالا قادر، ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری میں ان کی خارجی زندگی کا

بڑا دخل ہے۔عام شعرا کی نسبت ان کی زندگی عام نہ تھی۔سیاسی اور سماجی سطح پر اس میں بہت نشیب و فراز ملتے ہیں۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ راولپنڈی سازش کیس کے نتیجے میں چار سالہ اسیری ہے۔اسیری نے ذہنی، جسمانی اور جذباتی سطح پر فیض کو بہت مضطرب کیا مگر فیض کی تخلیقی صلاحیت پروان چڑھی۔حکومتی پابندی کے باعث زبان بندی کا حکم تھا چناں چہ فیض نے اسیری میں اپنی کیفیت اور بے گناہی کو شعر ہی میں پیش کیا، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں قدیم استعارے اور علامتیں زندہ ہوتی محسوس ہوتی ہیں:

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے عتاب جرم سخن سے پہلے
جو چل سکو تو چلو کہ راہ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل فراز دار و رسن سے پہلے
نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے
کرے کوئی تیغ کا نظارا اب ان کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جان بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے
غرور سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والئ چمن تھے عروج سرو و سمن سے پہلے
ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے ادھر تقاضائے درد دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیر ذکر وطن سے پہلے

اس بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زندانی اردو شاعری اپنے اندر ایک الگ تاثیر، جذبہ اور ولولہ رکھتی ہے۔

ہم نے جو طرز فغاں کی تھی قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

اردو کی زندانی شاعری بھی مقدار اور معیار کے اعتبار سے اس لائق ہے کہ عالمی زندانی ادب میں نمایاں جگہ پا سکے۔

انیقہ خالد

کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

تقسیمِ ہند، پنجابی کہانیوں کے تناظر میں (تین پنجابی کہانیوں کے حوالے سے)

ہجرت قدیم زمانے سے ہی دنیا بھر کے ادب اور شاعری کا اہم موضوع رہا ہے۔ دنیا بھر کے ادب کی طرح پنجابی ادب خصوصاً جدید پنجابی افسانوی ادب میں اس کے اثرات بہت گہرے ملتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ پنجاب اور پنجابیوں کا مختلف ادوار میں اس سے بلا واسطہ متاثر ہونا ہے۔ خاص طور پر ۱۹۴۷ء کی تقسیم نے اس خطے اور اس خطے کے لوگوں پر بعض ایسے نقوش چھوڑے، جو اب بھی ان کے دلوں اور روحوں پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں متاثر ہونے والے ان پنجابیوں میں کچھ تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جو شعر و ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ سے دل چسپی رکھتے تھے۔ اگرچہ پنجابی لکھنے والوں کی تعداد اتنی نہیں تھی جتنی اردو یا دیگر زبانوں میں لکھنے والوں کی تھی (مثلاً سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، اے حمید وغیرہ) تاہم بہت سے ایسے نام بھی ملتے ہیں جنھوں نے اس سانحے کو پنجابی کہانیوں میں بیان کیا۔ تقسیم کا یہ عمل پنجاب کے تمام لوگوں کے یہاں زیادہ 'ونڈ' اور 'لُٹ' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ان ناموں میں جنھوں نے پنجابی کہانیوں کے ذریعے تقسیم کو بیان کیا، کلونت سنگھ ورک، بلدیو سنگھ اور دیوندر ستیارتھی کے نام نمایاں ترین ہیں۔ ورک اور ستیارتھی خود اس تقسیم سے متاثر ہوئے۔

تہذیبی رنگا رنگی، رواداری اور بھائی چارے کی حامل اور امین دھرتی پنجاب کو ۱۹۴۷ء میں تقسیم اور تقسیم کے نتیجہ میں لوٹ مار، تباہی اور بربادی اور انسانیت سوزی جیسے سنگین مراحل سے گزرنا پڑا جس کے حوالے سے ہمیں شاعری اور کہانیوں کی صورت میں لاتعداد اندوہ ناک بیانات ملتے ہیں۔ پنجابی میں بھی بعض کہانیوں میں اس کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کی اہم اور بڑی وجہ شاید پنجاب اور پنجابیوں کا بہ راہِ راست متاثر ہونا بھی شامل ہے۔

اس مضمون میں تقسیم کے سانحے کو زیر بحث لایا گیا ہے اور اس حوالے سے لکھی گئی تین بہترین کہانیوں جن میں 'مینوں جاننا ئیں؟' از کلونت سنگھ ورک، ' آ بھین فاطمہ' از بلدیو سنگھ اور 'جنم بھومی' از دیوندر ستیارتھی شامل ہیں۔ان کہانیوں میں درج ذیل معاملات کا تجزیہ کیا جائے گا:

۱۔ ہجرت کے انسان کی نفسیاتی اور طبعی صورتِ حال پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

۲۔ انسان ہجرت کرنے کے بعد کس قسم کے حالات سے دو چار ہوتا ہے؟

۳۔ ہجرت کے بعد اگر وہ کردار اس تجربے کو بیان کرنا چاہے تو وہ پوچھنے والے کے سامنے کون سی تفصیلات رکھتا ہے؟ کیا کچھ پوری تفصیلات کے ساتھ بیان کرتا ہے اور کچھ چھپانا چاہتا ہے؟

۴۔ اپنے بارے میں کیا بتاتا ہے اور اپنی ہی جیسی صورتِ حال سے دو چار ہونے والے دوسرے لوگوں کے بارے میں کیا بتاتا ہے؟

۵۔ بھولتا کیا ہے؟

۶۔ یاد کیا رکھتا ہے؟

۷۔ وہ یہ سارا کچھ کیا سوچ کر بتا رہا ہوتا ہے کہ اسے اس سے کیا فائدہ ہوگا؟

۸۔ دوسری سرزمین کی طرف ہجرت کے بعد وہ کیسے رہ رہا ہے؟

۹۔ کیا وہ اس طرح اس زمین پر زندگی گزار رہا ہے جیسے اپنی جنم بھومی پر گزارتا تھا یا اس کے اندر بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں؟

۱۰۔ زبان و بیان اور واقعات کی تفصیلات کے ضمن میں وہ کس قسم کا طرزِ گفتگو اختیار کرتا ہے؟

بٹوارا ہوا، مختلف زبانیں بولنے والوں، مختلف ثقافت کے لوگوں کو الگ الگ خطوں میں بانٹ دیا گیا۔یوں ظاہری تقسیم کا عمل پیش فرما رہا مگر اس تقسیم نے انفرادی طور پر ہر انسان کے اندر کو توڑ پھوڑ کا نشانہ بنایا، مختلف زبانوں کی اہمیت کو مٹی میں روند دیا۔اسی تقسیم کا شکار بہ راہِ راست پنجابی زبان بھی ہوئی۔لوگ اردو ہندی تنازعہ میں اتنا گم ہو گئے کہ باقی زبانوں کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔یہی وجہ ہے کہ اگر پنجابی زبان میں افسانے کے فن کو دیکھا جائے تو بہت

قیمتی اور نایاب افسانے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جوشوا فضل الدین واحد مصنف تھے جو پاکستانی پنجاب میں پنجابی لکھنے والے رہ گئے تھے اور انھوں نے اپنی توجہ انجیل کے پنجابی تراجم پر مرکوز کر لی۔ بھارت میں لکھنے والے مصنفین نے گُرمُکھی رسم الخط اپنایا جس کے باعث پنجابی پڑھنے اور لکھنے کا عمل کٹھن ہو گیا۔ تب چند اہم لکھنے والوں نے اپنی توجہ پنجابی زبان کی طرف کی اور ہمارے سامنے قابلِ قدر فن پارے پیش کیے۔

کلونت سنگھ ورک (۱۹۲۱ء تا ۱۹۸۷ء)، ضلع شیخو پورہ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے پنجابی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان میں بھی لکھا۔ ان کی کہانیوں کا روسی، جاپانی اور کئی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کو کئی سرکاری ایوارڈز سے بھی نوازا گیا جن میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (۱۹۶۸ء) بھی شامل ہے۔

کلونت سنگھ ورک کا افسانہ ''مینوں جانا ئیں؟'' تقسیم کے بعد انسان کے اندرونی اکیلے پن کی بہترین تصویر ہے۔ یہ افسانہ انسان کے باطن سے اس کا ظاہر بیان کرتا ہے۔ چوں کہ ہجرت کے عمل نے اس سے متاثر ہونے والوں پر برابر نقوش چھوڑے لہٰذا اس افسانے میں کرداروں کے خاص نام رکھ کر اسے چند لوگوں کے لیے مخصوص نہ کیا گیا۔ افسانے کے آغاز میں دیکھا جاتا ہے کہ کیسے ٹوکری اٹھانے والا انسانیت کی مٹی ہوئی تصویر پیش کرتا ہے اور جیسے ہی اسے اپنے وطن سے آیا ہوا ایک شخص ملتا ہے تو اس میں زندگی کی رمق جاگتی ہے۔ افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''کوئی سُرا ای نہیں لگا۔ مینوں تے سُرت ای ہن آئی اے، جیوں دا پار ٹپیاں مینوں تے جاندا ای کوئی نہیں سی۔''

انسان جہاں جنم لیتا ہے، وہ مٹی، وہ خطہ اس کے لیے اس کا گھر ہوتا ہے کیوں کہ اس کا بچپن، ماضی، خواب اور کلچر سب اسی ''گھر'' سے منسلک ہوتے ہیں۔ البتہ جب انسان ہجرت کے مراحل طے کرتا ہے تو یہ عمل انسان کے اندر ذہنی، جسمانی اور تہذیبی بحرانوں اور تبدیلیوں کو جنم دیتا ہے۔ اپنی مرضی سے کوئی جگہ چھوڑنا اور حالات و واقعات کی زد میں آ کر ہجرت کرنا انسان کو اندر تک تقسیم کر کے رکھ دیتا ہے۔

اس تحقیق میں شامل دوسری کہانی ''آ بھین فاطمہ'' ہے جو مشہور ناول نگار اور کہانی کار بلدیو سنگھ کی لکھت

ہے۔ بلدیو سنگھ، پنجابی ادبی دنیا میں 'بلدیو سنگھ سڑک نامہ' کے نام سے مشہور ہیں، ۱۹۴۲ء میں مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں چندنوا، موگا میں پیدا ہوئے۔ ان کی اہم کتب میں سڑک نامہ، لال بتی، ان داتا، اور سورج دی اکھ شامل ہیں، انھیں ان کی تخلیقات پر ملکی اور بین الاقوامی سطح کے کئی ایوارڈز مل چکے ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ سڑک نامہ کا اضافہ بھی اپنے اندر ایک کہانی رکھتا ہے۔ دراصل وہ ایک ٹرک ڈرائیور تھے اور انھیں لکھنے پڑھنے سے بھی خاص لگن تھی۔ انھوں نے اپنے سفری تجربات کو لکھنا شروع کیا اور لکھ کر امرتا پریتم کو بھیجنا شروع کر دیا۔ امرتا پریتم نے ان کی تخلیقات اپنے رسالے ناگ منی میں چھاپنا شروع کر دیں۔ یہ تحریریں سڑک نامہ کے نام سے شائع ہوتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اس کالم کی وجہ سے بلدیو سنگھ سڑک نامہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔

بلدیو سنگھ کی یہ کہانی ''آ بھین فاطمہ'' تقسیم کے نتیجہ میں آنے والے زخموں کی علامات اپنے اندر لیے ہوئے ہے البتہ اس کے اندر ایک تجربہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بلدیو سنگھ کا اپنا ہجرت کا تجربہ نہ تھا لیکن پنجاب میں تو یقیناً بہت کم گھر ایسے تھے جو ۱۹۴۷ء کے فسادات کی زد میں نہ آئے ہوں۔ انھوں نے اس کہانی کا خمیر ایک مسلمان گھرانے کی ہجرت سے اٹھایا جو سکھوں کے اکثریتی علاقے میں رہ رہا ہوتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار اپنی ماں کے ذریعے اس سارے خاندان پر گزری قیامت کا احوال سناتا ہے جو فاطمہ کی بچپن کی سہیلی ہوتی ہے اور پورا بچپن اور لڑکپن اس کے ساتھ کھیلتے، ہنستے، روتے اور ترنجن میں چرخہ کاتتے گزار دیتی ہے۔

یہ کہانی تقسیم کے حوالے سے شائع ہونے والے ایک انتخاب سے لی گئی ہے جسے معروف پنجابی شاعر، کہانی کار اور صحافی توقیر چغتائی نے ونجھلی (ونڈ بارے) کے نام سے مرتب کیا۔ اس میں تقسیم کے حوالے سے اہم پنجابی کہانی کاروں کی چودہ کہانیاں شامل ہیں۔

کہانی ایک گھر کے روزمرّہ معاملات سے شروع ہوتی ہے جس میں بیان کرنے والا جو اس کہانی کے مرکزی کردار یعنی اپنی ماں کی تقسیم سے جڑی بعض ناخوش گوار یادوں کو بیان کرتا ہے اور فاطمہ کے ساتھ ساتھ بعض مسلمان خاندانوں کا احوال بھی سناتا ہے۔ یہ کہانی بیان کنندہ کی ماں اور فاطمہ کی ان یادوں کو ایک ایک کر کے ہمارے سامنے لاتی ہے جو تقسیم سے پہلے ان کی بہنوں کی طرح محبت کو اجاگر کرتی ہیں۔ ایسی محبت جس سے سکھ یا مسلمان شناخت

بہت پیچھے رہ جاتی ہے اور انسانی محبت، رواداری، بھائی چارے اور ایک ساتھ مل کر رہنے کی تصویر کو سامنے لاتی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات وہ شناختیں جو زمین، تہذیب، زبان اور باہمی قدروں کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں وہ مذہبی شناخت کو غیر اہم اور ثانوی حیثیت پر لے جاتی ہیں۔

یہ کہانی ہمیں دو تہذیبوں کا امتزاج نظر آتی ہے۔ ایک پرانی تہذیب جو اپنی اقدار سے جڑی ہوئی ہے۔ چرخہ محض ایک چیز نہیں بلکہ یہ اس مشترکہ ورثے کی علامت ہے جو تقسیم سے پہلے لوگوں میں موجود تھا۔ اگرچہ تقسیم نے لوگوں کے دلوں میں پھوٹ ڈالنے کے عمل کو تیز تر کیا، لوگوں کو خون ریزی اور عصمت لوٹنے میں مشغول کر دیا، مگر یہ صرف ان لوگوں کا شیوہ رہا جن کا دل انسانیت کے درجے سے گر گیا اور ان میں حیوانیت جاگ اٹھی۔ اس کے برعکس چند ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کا دل انسانیت کے لیے دھڑکتا اور انسانی ہم دردی کی رمق ان میں اب بھی باقی تھی۔ کچھ اسی طرز کا کردار اس افسانے میں ہمیں نظر آتا ہے۔ جب سکھ بیٹے نے ماں سے پوچھا کہ کیا مسلمانوں نے فسادات کے مقابلے میں لڑائی کی تو ماں نے بجائے اپنے بیٹے کے دل میں نفرت کی آگ بھڑکانے کے کہا کہ وہ تو خود پریشان حال تھے۔ افسانے سے ملاحظہ ہو:

''کاہدا لڑنا سی پت؟ جیہناں اتے مان سی، اوہی لٹاں کھوہاں وچ موہری بن گئے۔ مسلمان تاں شرم دے مارے بھیڈاں بکریاں آنگوں سرسٹ کے بہہ گئے۔ پنڈ آپنے گھر دے ساہمنے کھلی تھاں سی۔ اوتھے کٹھے سی سارے مسلمان۔''

اس کے مقابلے میں ہم ایک نئی تہذیب کو دیکھتے ہیں جو دورِ جدید کی پیداوار ہے۔ جس کے لیے پرانی اقدار اور اشیا بے معنی ہیں اور وہ ان کا تمسخر اڑاتی ہے۔ یہ چرخہ جہاں بیان کرنے والے کی والدہ کے لیے فاطمہ کی ذات ہے جس سے وہ الگ نہیں ہونا چاہتی تو وہاں یہ چرخہ نئے لوگوں (بے بے کے بیٹے) کے لیے گھر میں موجود ایک فالتو چیز ہے جس کو وہ باہر پھینکنا چاہتے ہیں۔

تیسری کہانی ''جنم بھومی'' بھی ہجرت کے پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ اس افسانے کے تخلیق کار دیوندر ستیارتھی ۱۹۰۸ء کو بھدوڑ میں پیدا ہوئے۔ ایک ہجرت تعلیم، تفریح یا معاش کی تلاش میں کی جاتی ہے جس میں انسان کی مرضی

شامل ہوتی ہے اور دوسری ہجرت قوموں کی تقسیم کے باعث وقوع پذیر ہوتی ہے۔ دیوندر، دونوں قسم کی تقسیم کا شکار ہوئے۔ پہلے وہ ادبی مرکز میں نام کمانے کے لیے بھدوڑ سے لاہور اپنی مرضی سے ہجرت کر کے آئے۔ اس کے بعد انھوں نے الٰہ آباد ہجرت کی۔ انھوں نے سنیاسی کا روپ دھار کر پاکستان، ہندوستان، نیپال، سری لنکا، برما، بنگلہ دیش وغیرہ کا سفر کیا۔ لوک گیتوں پر ان کے مضامین، مشہور رسالوں ماڈرن ریویو اور ایشیا میں چھپتے رہے۔ ۱۹۷۶ء میں انھیں 'پدم شری' ایوارڈ سے نوازا گیا اور ۱۹۷۷ء میں انھیں 'شریشٹھ ہندی لیکھک' کا اعزاز دیا گیا۔ ان کے ہاں طنز و تمسخر کی بجائے ہم دردی اور دردمندی کے جذبات نمایاں نظر آتے ہیں۔

کہانی ''جنم بھومی'' کی تفصیل کچھ یوں ہے: ہربنس پورہ کے اسٹیشن پر رکی ریل گاڑی کے ایک ڈبے میں موجود ایک خاندان جس میں سکول ماسٹر، اس کی ادھیڑ عمر کی بیمار بیوی، ان کی دو بیٹیوں، سات سال کی کانتا اور پانچ سال کی شانتا اور ان کے نومولود بیٹے کو افسانے کے پلاٹ کے لیے چنا گیا اور مکالماتی اسلوب اختیار کرتے ہوئے سادہ واقعات بیان کیے گئے۔ مکالموں کے ذریعے ہماری توجہ تقسیم کے بعد اٹھنے والے شکوک وشبہات کی طرف مبذول کروائی گئی۔ اسٹیشن پر رکی گاڑی کو بھی لوگ انگریزوں کی سازش سمجھ رہے ہیں اور نئے ملک کے بارے میں قیاس آرائیوں اور خوش گپیوں میں مگن ہیں۔ لوگ اس خوش فہمی کا شکار ہیں کہ نئے ملک میں امن اور خوش حالی ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہیں مگر ماسٹر صاحب کا ذہن اس بات پر سوچ بچار کر رہا ہے کہ وہاں نئے شہر میں بھی فسادات برپا کیے جائیں گے اور یہی ہجرت کرنے والے لوگ ان فسادات کا شکار ہوتے رہیں گے۔ گاڑی میں موجود لوگوں کی جنم بھومی میں تباہی برپا کر کے ان کو ان کے گھروں سے بے دخل کر دیا گیا ہے اور یہ ہجرت کرنے والے لوگ یوں ہی دربدر پھرتے رہیں گے کیوں کہ ان کو اور کوئی زمین، کوئی خطہ تسلیم نہیں کرے گا۔

ہجرت کے موقع پر غیر انسانی حرکات کا جہاں دوسرے افسانہ نگاروں نے ذکر کیا، اسی طرح اس افسانے میں بھی انسانی حقوق کے استحصال کا ذکر کیا گیا کہ کس طرح پانی کی ایک ایک بوند کو بیچا جانے لگا اور کیسے پانی فروخت کرنے والے لٹے پٹے انسانوں کو پانی کے لیے ترسانے لگے۔ یہ غیر انسانی حرکت مادہ پرستی کے بوئے ہوئے بیج کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

چندلوگوں نے ہجرت کے نتیجے میں نقل مکانی کوترجیح دی۔اس کے برعکس کچھ لوگوں نے اسی جگہ مرجانے کو بہتر جانا۔اس کہانی میں ہمیں دونوں طرح کے لوگ نظر آتے ہیں۔اس پریشان حال سکول ماسٹر کی بیوی اور بیٹے نے اسی جگہ مرنا پسند کیا جہاں انھوں نے جنم لیا اور اس شخص نے اپنی چادران پر ڈال دی اور چادر کی خاص بات یہ تھی کہ:''موڈھیاں تے ولیٹی ہوئی پاٹی پرانی چادرنوں مڑمڑ سنبھالدا سی۔ایس نوں اوہ آپنی جنم بھومی توں بچا کے لیایا سی۔بلوائیاں دے اچانک پنڈ وچ آ جان کر کے اوہ کجھ وی تاں نہیں کڈھ سکیا سی۔ بڑی مشکل نال بھج تریا سی۔ہن ایس چادر تے انگلاں گھماندیاں اوس نوں پنڈ دی رہنی بہنی یاد آون لگ پئی۔ایس چادر تے انگلاں گھماوندیاں اوس نوں جیویں اوس مٹی دی سگندھ آون لگ پئی، جس نوں اوہ ورھیاں بدھی سنگھدا آیا سی۔''

اس چادر کا اپنی بیوی اور بیٹے کی لاشوں پر ڈالنا تھا کہ سکول ماسٹر کو یوں محسوس ہوا، جیسے وہ اپنے خاندان کے ایک حصے کو اپنی زمین کے حوالے کر آیا اور دوسرے حصے جو کہ نئی نسل ہے، کو اپنے ساتھ دوسرے ملک کی زمین کی طرف لے کر بڑھا۔اس کے مطمئن ہونے کی کیفیت کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ افسانہ نگار افسانے کا اختتام یوں کرتے ہیں:''گڈی تیز ہوگئی سی، کا نتا دی آواز ہوا چ اچھل کے رہ گئی سی۔سکول ماسٹر نے شانتا نوں گود وچ چک لیا، تے مڑ کے لاش ول نہ تکیا۔''

اس مضمون سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگرچہ تینوں کہانیوں میں ہجرت کو موضوع بنایا گیا مگر تمام کہانیاں اپنے کرداروں، پلاٹ اور بیانیے میں منفرد اہمیت کی حامل ہیں۔ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں، ہجرت کے پیچیدہ عمل کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں اور مختلف خطوں میں موجود افسانہ نگاروں کے ذریعے ہجرت کے اثرات بیان کرتی ہیں۔تمام کردار اپنے ظاہری و باطنی وجود میں تقسیم کے عمل کو محسوس کرتے ہیں اور اس جان لیوا کرب کا شکار ہیں جو کسی مجبوری کے تحت اپنی زمین اور وطن چھوڑنے کے نتیجہ میں سامنے آتا ہے۔

دانش خان
اردو شاعری اور شعریات

اقبال کی رومانوی شاعری، پس منظر اور تجزیہ

علامہ محمد اقبال کا شمار برِصغیر کے دانش وروں، فلسفیوں، مفکروں اور شاعروں کے ہراول دستے میں ہوتا ہے۔ یقیناً اقبال جیسی شخصیت کا تعارف چند لفظوں میں ناممکن ہے مگر خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب فکرِ اقبال کی تمہید میں اقبال کا تعارف کچھ اس طرح سے کرواتے ہیں:

> اقبال شاعر بھی ہے اور مفکر بھی، وہ حکیم بھی ہے اور کلیم بھی، وہ خودی کا پیغامبر بھی ہے اور بے خودی کا رمز شناس بھی، وہ تہذیب وتمدن کا نقاد بھی ہے، وہ توقیر آدم کا مبلغ بھی ہے اور تحقیر انسان سے دردمند بھی۔

اقبال کی وجہ سے اردو اور فارسی ادب میں بہت معیاری مواد شامل ہوا۔ اقبال نے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک وکیل اور سیاست دان کی حیثیت سے ملک وقوم کی خدمت کی۔ انگلستان سے تعلیم حاصل کر کے اپنی قوم کی خدمت کے لیے وطن واپس لوٹے اور اپنے حصّے کی ایسی شمع جلائی جس کی روشنی آج تک باقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کا کلام، فکر اور زندگی آج اقبالیات کے نام سے ایک مضمون بن کر پوری دنیا میں موجود ہے۔ اس مضمون میں طلبہ پی۔ایچ۔ڈی۔ کرتے ہیں۔

اقبال کے یوں تو بہت سارے موضوعات اہم ہیں جن میں تصوف، خودی، اسلام، قدرت اور عشق شامل ہیں۔ رومانویت کا موضوع اقبال کی شاعری میں اہم ہے مگر اس حوالے سے عام طور پر یہ سوچ پائی جاتی ہے کہ اقبال کی رومانوی شاعری صرف عشقِ حقیقی کے بارے میں ہی ہے جب کہ یہ تصور غلط ہے کیوں کہ اقبال کلاسیکی تصورِ عشق

کو ماننے والے تھے اور خود اس میں گرفتار بھی رہے۔خیالات اور نظریات کی وسعت میں عشقِ حقیقی کا عنصر غالب نظر آتا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اقبال کے ہاں عشقِ مجازی کی تکفیر نظر نہیں آتی۔

اقبال کی عشقیہ شاعری پر تنقید عام ہے جس میں تاثر یہ ہے کہ اقبال کو انسان سے عشق ہو ہی نہیں سکتا۔اس بات کا اظہار پروفیسر محمد عثمان نے اپنے تحریر کردہ مضمون ''اقبال کی عشقیہ شاعری'' میں کیا۔ اقبال پر اس تنقید کو کرنے والوں کو اس بات سے آگاہ رہنا چاہیے کہ جوانی کے دوران انسان جن حالات وجذبات سے گزرتا ہے اس میں اسے قدرتی طور پر اس انسانی جذبے کو محسوس کرنے کا موقع ملتا ہے۔اگر وہ شاعر ہو تو وہ اس کے بارے میں شعر کہتا ہے۔ اقبال کی جوانی کی شاعری کو اُن کی جوانی کے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔جب انسان اپنی زندگی کے اس دور سے گزر جاتا ہے تو پھر اُس کی سوچ میں وقت کے ساتھ پیدا ہونے والی وسعت کی وجہ سے وہ دوسرے مسائل وافکار کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جہاں ہمیں اقبال کی شاعری میں عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور عشقِ خداوندِ کریم نظر آتا ہے وہیں اُن کی شاعری کے کچھ حصوں میں اپنی کسی محبوبہ کے نام لکھے اشعار بھی نظر آتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شاعر اپنے احساسات کو شاعری میں بیان کرتا ہے، ان میں کچھ سچ اور کچھ تصوراتی ہوتے ہیں۔اقبال کے ہاں، اُن کی زندگی میں محبت کا احساس واضح طور پر دیکھنے، پڑھنے اور محسوس کرنے کو ملتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس دور میں اقبال نے اپنی محبوبہ کے نام بھی شعر لکھے اور ان میں اپنے احساسات بھی۔اس کی مثال اقبال کی نظم ''فراق'' کے اس شعر میں ملتی ہے:

سکوتِ شامِ جدائی ہوا بہانہ مجھے
کسی کی یاد نے سکھلا دیا ترانہ مجھے

اقبال نے اپنی عشقیہ شاعری کا ایک حصّہ خود اپنے ہاتھوں سے تلف کیا۔ یہ بات راز رہتی مگر عطیہ فیضی کے ذریعے یہ بات دنیا کو معلوم ہوئی۔عطیہ فیضی کے نام لکھے ہوئے خط میں اقبال لکھتے ہیں:

> گزشتہ پانچ چھ سال سے میری نظمیں زیادہ تر پرائیوٹ نوعیت کی حامل ہیں اور میں سمجھتا ہوں پبلک کو اُنھیں پڑھنے کا حق نہیں۔بعض تو میں نے خود تلف کر ڈالیں ہیں تاکہ اُنھیں کوئی چُرا کر شائع نہ کرا دے۔ (اقبال نامہ، حصہ دوم، مرتب شیخ عطا اللہ، ص ۱۴۸)

وہ خطوط جو عطیہ نے شائع کیے، وہ پروفیسر محمد عثمان کی نظر میں بانگِ درا کی کچھ نظموں کے ساتھ رکھیں تو دونوں میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ اُن نظموں کا پس منظر دراصل وہ خطوط ہیں۔ یقیناً اس سے یہ بات واضح ہے کہ اقبال اِن تمام احساسات سے گزر کر ہی اس مقام تک پہنچے جو ہمیں عام طور پر اُن کے بارے میں سننے کو ملتے ہیں۔ اقبال اس بات سے خود بہ خوبی واقف تھے کہ لوگوں کا اُن کے بارے میں کیا خیال ہے اور لوگ اس قسم کی شاعری کو کس طرح سے سمجھیں گے اور اس سے کیا تاثر جنم لے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اقبال کی عشقیہ شاعری کے ممکنہ بڑے حصے سے محروم رہے۔ معاشرے میں آج بھی عشقِ حقیقی اور مجازی ایک صف میں کھڑے نہیں ہو سکتے اور یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کی تکفیر بھی کی جاتی ہے اور یوں دونوں کے اصل کو سمجھنے سے عام طور پر لوگ قاصر رہتے ہیں۔

اقبال نے شاعری کے ابتدائی دور میں ایک نظم ''وصال'' لکھی جو ایک نوجوان کی عشقیہ خواہشات سے بھرپور ہے۔ اس نظم میں اقبال اپنے معیار اور خواہشات کے مطابق ایک خاتون کے منتظر ہیں۔ ایک نوجوان جس کو یہ لگتا ہے کہ اس وقت میں اُس کی سب سے بڑی اور اہم ضرورت یہی ہے کہ اسے کوئی مل جائے اور یورپ جانے کے بعد اسے وہ نایاب ہیرا مل گیا، جس کی اسے تلاش تھی اور یوں اُس کے دل کی کیفیت مکمل بدل گئی اور اب ہر لمحہ لذّت سے بھرپور محسوس ہونے لگا۔ اس نظم کے دو بند ہیں، پہلے میں گزشتہ حالت کو پیش کیا اور دوسرے میں یار کے ملنے کے بعد کی خوشی کا اظہار ہے۔ چند شعر پیشِ خدمت ہیں:

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل
خوبیِ قسمت سے آخر مل وہ گل مجھے
خود تڑپتا تھا، چمن والوں کو تڑپاتا تھا میں
تجھ کو جب رنگین نوا پاتا تھا، شرماتا تھا میں

اقبال کی شاعری اور بالخصوص رومانوی شاعری میں ایک بہت اہم عنصر جذبات کی اہمیت ہے جو یقیناً ہر شاعر کے لیے نہایت اہم ہوتی ہے اور پھر اقبال جیسے شاعر تو اپنے کلام کا زیادہ تر حصہ انھی جذبات و احساسات کی دنیا سے لاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک جذبات فن کی روح ہوتے ہیں:

نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

اقبال کی نظم ''حسن و عشق'' اس سلسلۂ عشق کی دوسری کڑی ہے۔ اس نظم میں اقبال اپنی محبت کی شدت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے محبوب کی تعریف میں مختلف علامتوں کے استعمال سے مصرعوں کو کچھ اس طرح سے لکھتے ہیں کہ پڑھنے والا بس پڑھتا جاتا ہے۔ اپنے جذبات کو لفظوں میں بیان کرنا یقیناً ایک بہت مشکل کام ہے اور اقبال کی نظم سے یوں لگتا ہے جیسے انھوں نے یہ کام بڑی آسانی سے کر لیا ہو اور یہی ایک بڑے شاعر کی پہچان ہے۔ ایک بات جس کا ذکر ہم اس سے پہلے بھی کر چکے ہیں کہ یہ انداز اکثر غزلوں میں نظر آتا ہے مگر اقبال اسی رنگ اور انداز کو نظموں میں بھی استعمال کرتے رہے ہیں۔ اپنے محبوب کی تعریف کرنے کی اعلیٰ مثال یہ ہے:

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمین قمر
نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم، نور کا لے کر آنچل
چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم
موجہ نکہت گلزار میں غنچے کی شمیم

اسی طرح اقبال نے اس دور میں مختلف نظمیں لکھیں جو دراصل اقبال کے عشقیہ دور کی نظمیں سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں چند اہم نظموں میں ''فراق''، ''حسن و عشق''، ''محبت''، ''سلیمی'' اور ''کلی'' ہیں۔ ان میں اقبال نے عام انداز سے ہٹ کر محبت کا اظہار کیا جو اقبال کی شاعری کے بعد کے ادوار میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اردو شاعری میں اقبال کی طرح اپنے محبوب کی تعریف کا بیان کرنے کی مثال ہمیں شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ نظم ''محبت'' میں ایک بلی بھی اس حسن کے تاثر میں گرفتار ہو گئی جس سے شاعر خود متاثر تھا۔ جذبات کے اظہار کے لیے کسی بلی کا استعمال عجیب مگر دل چسپ اور معنی خیز ہے۔ اقبال کے عشق کی یہ داستان اور یہ اندازِ محبت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ اس سلسلے کے آخر میں اہم نظم ''نوائے غم'' ہے جس کی خاص بات اس میں موجود نشاط انگیز لہجے کی عدم موجودگی ہے جو اقبال کی دوسری عشقیہ

نظموں میں نظر آتا ہے۔ اس نظم میں تو درد و یاس کے علاوہ کچھ محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نہایت ڈھکے چھپے الفاظ میں محبت میں ناکامی اور پامالی جیسی کیفیات کا اظہار کرتے کچھ اس طرح نظر آتا ہے:

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش
جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش
بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار
جس کے ہر تار میں ہیں سینکڑوں نغموں کے مزار
محشرستان نوا کا ہے امیں جس کا سکوت
اور منت کش ہنگامہ نہیں جس کا سکوت
آہ امید محبت کی بر آئی نہ کبھی
چوٹ مضراب کی اس ساز نے کھائی نہ کبھی

یوں اقبال کی مختلف نظموں میں اپنے محبوب سے عقیدت کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ ایک مثال نظم ''پھول کا تحفہ ملنے پر'' ہے جس میں اقبال نے شہزادی دلیپ سنگھ کی جانب سے دی گئی ضیافت میں شرکت کی۔ وہاں شہزادی کی ایک انگریز دوست نے باغ سے پھول توڑ کر اقبال کو دیا جس سے اقبال کے جذبات کو خوب تحریک ملی۔ اقبال نے ان جذبات کا اظہار اپنی اس نظم میں بہت عمدگی سے کیا۔ اس کا ذکر اقبال عطیہ فیضی کے نام لکھے ایک خط میں بھی کرتے ہیں۔ اقبال نے اس نظم میں نہایت خوبصورتی سے اس پھول کی خوش قسمتی کا اظہار کیا ہے کہ اُسے اُن ہاتھوں نے توڑا۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اس بات کو دیکھ کر دوسرے پھول تڑپتے رہ گئے۔ یوں لگتا ہے جیسے شاعر کو اپنی ناکامی کا احساس تڑپانے لگتا ہے۔ اس بات کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

تجھے وہ شاخ سے توڑیں! زہے نصیب ترے
تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب ترے
اُٹھا کے صدمۂ فرقت وصال تک پہنچا
تری حیات کا جوہر، کمال تک پہنچا

یوں اقبال کی عشقیہ شاعری عام طور پر ہونے والی عشقیہ شاعری سے بہت مختلف تھی۔ اقبال نے جس طرح اس دور میں کی راعنائیوں کا ذکر اپنے منفرد انداز میں کیا جس میں وہ قدرتی عناصر کا استعمال خوب صورت انداز میں کرتے ہیں۔ اس انداز میں کیا جانے والا اظہارِ محبت یقیناً قارئین کے لیے پُر لطف اور نئے شعرا کے لیے سیکھنے کا ذریعہ ہے۔

یہ کہنا بجا ہے کہ اقبال کی عشقیہ شاعری ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے اور اس میں موجود گہرائی اور اسلوب کی مثال ہمیں عام طور پر نہیں ملتی۔ عشق اقبال کے لیے اتنا ہی اہم موضوع ہے جتنا کہ خودی۔ اقبال کے نزدیک خودی ہی انسان کو عشق کی منازل طے کروانے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ جب تک ایک انسان خود کو نہیں جانتا اور پہچانتا، تب تک وہ عشق خالق سے کر سکتا ہے نہ اس کی مخلوق سے۔ اقبال کے تصورِ عشق کے حوالے سے میں اتنی ہی بات کہہ سکتا ہوں کہ میرے نزدیک عشق کی اصل کو سمجھنے اور نبھانے کے لیے اقبال کا تصورِ عشق یقینا کافی ہے مگر اس کو سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ زندگی میں عشق کی اہمیت کا اندازہ اقبال کی اس تمام عشقیہ شاعری سے ہوتا ہے۔ ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لیے اپنے کام، اپنی ذات، اپنے اردگرد موجود لوگوں، معاشرے کی بہتری کی سوچ اور سب سے بڑھ کر خداوندِ کریم سے محبت اور خلاقِ خدا سے محبت کرنا بہت ضروری ہے۔

محمد علی

اردو شاعری اور شعریات

ناصر کاظمی کا تہذیبی ناسٹیلجیا

تقسیم کے بعد برصغیر کے سیاسی و سماجی حالات غیر مستحکم تھے۔ آزادی کے واسطے عوام کو جو دکھ دیے گئے انھوں نے دونوں ملکوں کی عوام کو ذہنی طور پر شدید متاثر کیا تھا۔ لوگوں کو اپنے گھروں سے بے سروسامان نکلنا پڑا، قتل و غارت گری کے واقعات ہوئے، افراد اپنے خاندانوں سے بچھڑ گئے۔ اس دکھ اور درد کو عام طور پر دونوں ممالک کے لوگوں نے اور خاص طور پر شاعروں اور ادیبوں نے محسوس کیا۔ اس دور کے اکثر شعرا نے اپنی شاعری میں ہجرت کا دکھ، تکلیفیں اور پرانی یادیں بیان کی ہیں۔ ناصر کاظمی پاکستان کے وہ شاعر ہیں جنھوں نے اپنے ہم عصر شعرا میں اس دکھ کو سب سے زیادہ اپنی شاعری میں بیان کیا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بدلتی ہوئی تہذیب کا دکھ، پرانی اقدار کی خوشبو اور انھیں بھولنے کا دکھ بھی بیان کیا ہے۔

ناصر کی شاعری میں تقسیمِ ہند، ہجرت اور بے سروسامانی کا کرب نمایاں ہے۔ ناصر نے آبائی گھر چھوڑ کر ہجرت کی اور نومولود پاکستان میں تکلیفیں اٹھائیں۔ اندازہ کیجیے کہ ایک نوجوان جس کی زندگی میں بہار عروج پر ہے اور اس کی شاعری کا ابھی آغاز ہوا ہے، اس کو اپنا سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑے تو اس کے حساس دل پر کیا گزری ہوگی۔ ہجرت بھی اس قدر خوں ریز کہ دونوں طرف خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں، مکانات، بستیاں، کھیت کھلیان جل رہے تھے، سر بازار عصمتیں پامال ہو رہی تھی، محلوں میں رہنے والے سڑکوں پر تھے۔ ہر طرف اندھیرا اور خوف زدہ چیخیں تھیں۔ انھی چیخوں کی گونج ہمیں ناصر کی شاعری میں سنائی دیتی ہے۔ ناصر کا اپنا ملک چھوڑنے کا غم ہی کیا کم تھا لیکن ان کے دل پر دوسروں کے غموں نے ایسے زخم لگائے جو تمام عمر نہ بھر سکے۔ ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں تقسیم کے وقت کی جو منظر کشی کی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ سانحہ ان کے لیے کس قدر اہم اور چونکا دینے والا تھا۔

اشعار ملاحظہ کریں:

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے
اک طرف جھوم کر بہار آئی
اک طرف آشیاں جلائے گئے
اک طرف خون دل بھی تھا نایاب
اک طرف جشن جم منائے گئے
کیا کہوں کس طرح سر بازار
عصمتوں کے دیے بجھائے گئے

اڑ گئے شاخوں سے یہ کہہ کر طیور
اس گلستاں کی ہوا میں زہر ہے

ناصران خونیں حالات، اجڑے آشیاں کی باقیات اور بچھڑنے والوں کے غم میں نوحہ کرتے بھی نظر آتے ہیں:

یہاں اک شہر تھا شہرِ نگاراں
نہ چھوڑی وقت نے اس کی نشانی

پکارتی ہیں فرصتیں کہاں گئیں وہ صحبتیں
زمیں نگل گئی انھیں کہ آسماں کھا گیا

جہاں تنہائیاں سر پھوڑ کے سو جاتی ہیں
ان مکانوں میں عجب لوگ رہا کرتے تھے

اپنے آبائی گھر اور اپنے عزیزوں دوستوں سے دوری کے کرب کو ناصر نے جس پر اثر انداز میں بیان کیا ہے

وہ انھی کا حصہ ہے۔ناصر کے ہاں تقسیم کے خوں ریز حالات کے ساتھ ساتھ ہجرت کے دشوار اور پر خطر سفر کا بھی ذکر ہے۔ یہ سفر کوئی عام سفر نہیں تھا۔ اپنا ٹھکانا چھوڑ کر انجان منزل کی جانب ہجرت کرنا آسان کام نہیں ۔راہ کی دشواریاں، شر پسندوں کا خوف اپنی جگہ، کب کوئی قافلہ لوٹ لیا جائے، کب کوئی قتل کر دیا جائے، کچھ معلوم نہیں۔ مہاجرین تو انجان راستوں سے جان بچاتے منزل کی جانب بڑھ رہے تھے،لیکن منزل پہ کب پہنچیں گے، کیسے پہنچیں گے،اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ہجرت کے اس سفر میں ناصر نے نہ صرف اپنا دکھ بلکہ اپنے قافلے کے لوگوں کا اور دوسرے قافلوں کا دکھ بھی محسوس کیا ہے۔

یہ سفر واقعی عام سفر نہیں تھا۔نہ مال، نہ اسباب، نہ جان کی حفاظت، بے سروسامانی، غربت اور سب سے بڑھ کر اپنوں سے بچھڑنے کا غم۔ان اپنوں میں ان کا شہر بھی تھا، ان کی گلیاں، ان کے دوست، ان کا گھر، ان کے بچپن کی یادیں، ان کے درخت، ان کے کبوتر بھی تھے جن کو وہ چھوڑ کر آئے تھے۔ یہ بے سروسامان قافلے راستے میں جگہ جگہ قیام کرتے ہوئے ایک نامعلوم منزل کی جانب گام زن تھے۔ ناصر کھلی آنکھوں سے اس دشوار گزار سفر کو دیکھ رہے تھے۔اسی کے سبب ہمیں ان کی شاعری میں سفر، قافلے، منزل، رستے، بستی وغیرہ کا ذکر بہت ملتا ہے:

نہ جانے کہاں لے گئے قافلے
مسافر بڑی دور جا کر ملے
جہاں کوئی بستی نظر آ گئی
وہیں رک گئے اجنبی قافلے

منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے
جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے
روداد سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

ہجرت کرنے والے ان قافلوں میں زندہ لوگوں کی تعداد کم ہوتی جاتی تھی۔ جن کے ساتھ ایک نئی دنیا کی امید میں چلے تھے، راستے نے ان کو چھین لیا تھا:

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں، گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہم سفر تھا مثالِ گردِ سفر گیا وہ

نئے ملک میں پہنچ کر سفر کی مشکلات ختم ہوئیں اور ایک نئی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ یہ جدوجہد اپنے وجود کی بقا کی تھی اور اپنے گھر کے تحفظ کی تھی جب تباہ حال مہاجرین اپنا سب کچھ لٹا کر پاکستان پہنچے تو یہاں ایک اجڑا ہوا معاشرہ اور بے سروسامان ملک ان کا استقبال کر رہا تھا۔ ناصر نے تقسیم کے بعد پاکستان کی ابتر صورتِ حال کو بھی بیان کیا ہے۔ ان کے اشعار میں سنسان فضاؤں، سناٹوں، خاک وخون، جلے ہوؤں کی راکھ اور معاشی ومعاشرتی ابتری کا عکس دیکھا جاسکتا ہے:

سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بیکار
راتوں اٹھ اٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ

کیا کہوں اب تمھیں خزاں والوں
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

چیخ رہے ہیں خالی کمرے
شام سے کتنی تیز ہوا ہے
دروازے سر پھوڑ رہے ہیں
کون اس گھر کو چھوڑ گیا ہے

ایک اور بات جس نے ناصر کو بہت متاثر کیا، وہ نئے شہر اور لوگوں کی اجنبیت تھی۔ ناصر اس سے پہلے بھی لاہور آتے رہے تھے۔ مگر اس بار تو اپنا وطن ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ اب یہی ان کا وطن تھا۔ ناصر کی نظریں

وہی انبالے کے مناظر، وہاں کی گلیاں، وہاں کے دوستوں کو تلاش کرتی رہتی تھی، مگر ہر جگہ اجنبیت اور نئے لوگ تھے:

کھلی جو آنکھ تو کچھ اور ہی سماں دیکھا
وہ لوگ تھے نہ وہ جلسے، نہ شہرِ رعنائی
کوئی صورت آشنا اپنا نہ بیگانہ کوئی
کچھ کہو یارو، یہ بستی ہے کہ ویرانہ کوئی

ناصر اس دیار میں
کتنا اجنبی ہے تو

جب بھی نئے سفر پر جاتا ہوں ناصر
پچھلے سفر کے ساتھی دھیان میں آتے ہیں

یہ ان لوگوں اور ان محفلوں کی بات ہے جنھیں وہ انبالے میں چھوڑ آئے تھے۔ ان کے اشعار میں وہ کیفیتیں ہیں جو بہ ظاہر عام نظر آتی ہیں مگر ان کا اظہار بہت مشکل ہے، وہ کیفیات نظر آتی ہیں جو بہ ظاہر خاموش ہیں مگر محسوس کرنے والے کے لیے طوفان اٹھاتی ہوئی ہیں:

آ کے منزل پہ آنکھ بھر آئی
سب مزہ رفتگاں نے چھین لیا

ناصر کے یہاں 'رفتگاں' کا بہت تذکرہ نظر آتا ہے:

دلِ ویراں میں دوستوں کی یاد
جیسے جگنو ہوں داغ میں گل کے

ناصر کے دل میں ماضی کی کئی یادیں ہیں جو ان کے دل کو بے چین کیے دیتی ہیں۔ ایک ان کے بچپن کے حسین زمانوں کی یاد بھی ہے:

بچپن میں وہی کھلاڑی بنا ہے اپنا میت
جس نے اونچی ڈال سے توڑے زرد سنہری بیر

ناصر کاظمی بچپن ہی سے اپنے وطن کی مٹی سے گہرا تعلق رکھتے تھے، جس نے انھیں جنم دیا:

پیارے دیس کی پیاری مٹی
سونے پر ہے بھاری مٹی

بچپن ہی سے ان کے دل و دماغ میں اپنے علاقے، قصبے کے سماجی اور تہذیبی رنگ بھرتے رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس تہذیبی فضا کے ناگزیر جزو ہیں۔ وہ موسموں، آس پاس کے ماحول اور خاموشیوں سے اثرات قبول کرتے ہیں۔ وہ مقامی زندگی کے تہواروں اور رشتوں سے واقف ہیں۔ اس چھوٹے سے معاشرے میں انسانی دکھوں اور احساسات سے متاثر ہوتے ہیں۔ درج ذیل اشعار میں پچھلی رات، گلی، دیا، خالی کمرہ، بے خوابی، جنگل، پتوں کا میلہ ایک تہذیبی فضا کا پتا دیتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ فضا ناصر کے اندر ایک وجود رکھتی ہے اور یہ اوپر سے لادی نہیں گئی ہے:

او پچھلی رات کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں
تیری گلی میں سارا دن
دکھ کے کنکر چنتا ہوں
میرا دیا جلائے کون
میں تیرا خالی کمرا ہوں

تو جیون کی بھری گلی
میں جنگل کا رستہ ہوں

تو ہے اور بے خواب دریچے
میں ہوں اور سنسان گلی ہے

ناصر کاظمی کا ماضی سے وابستگی کا یہ رجحان اقبال کے یہاں 'کھوئے ہوؤں کی جستجو' کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ناصر کاظمی ماضی کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ شان دار روایات اور اقدار ان کے لہو میں ہیں۔ ناصر کی ماضی کی صحبتوں اور لوگوں سے وابستگی کا انداز اپنا ہی ہے۔ ان کی وابستگی ایک معصوم بچے کی وابستگی لگتی ہے جو کسی میلے میں اپنوں سے بچھڑ کر ایک پل کے لیے انھیں بھول نہ سکے:

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے
کانٹے چھوڑ گئی آندھی
لے گئی اچھے پھول

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے

ناصر جب ہجرت کر کے لاہور آئے تو انھیں یہ شہر بھی پسند آیا۔ وہ یہاں کی ہر چیز، درختوں، پرندوں، بازاروں، گلیوں، سے پیار کرتے ہیں۔ یہاں کی رونقیں ناصر کو بھا گئیں:

شہر لاہور تیری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی ہے مجھ کو

ناصر کو انبالہ کی طرح لاہور سے بھی انس رہا۔ انھوں نے یہاں کی کالی راتوں اور سڑکوں سے دوستی کی جہاں کے درخت اور کبوتر ناصر کے دوست تھے۔ جب یہاں کی رونقیں ماند پڑنے لگیں تو ناصر نے اسے محسوس کیا اور کہا:

وہ شاعروں کا شہر وہ لاہور بجھ گیا
اگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی

یہ شعر ایک طرح سے لاہور کی تہذیبی زندگی کا نوحہ بھی ہے۔ وہ اس بات پر افسوس کر رہے ہیں کہ وہ لوگ نہیں رہے، وہ محفلیں نہیں رہیں جن کے دم سے رونقیں تھیں۔ ناصر مجلسوں کے آدمی تھے، شام کو ان کی محفلیں کہیں نہ

کہیں، کسی سبزہ زار، کسی ریستوران میں جمتی تھیں۔ ان محفلوں کے ختم ہونے کے اثرات، دوستوں کے دور چلے جانے کے اثرات ناصر کی طبیعت پر بھی پڑے:

دوست بچھڑے ہیں کئی بار
مگر یہ نیا داغ کھلا ہے اب کے

پھر اس مٹتی ہوئی تہذیب کی یاد ہے جس میں ناصر نے پرورش پائی تھی۔ شعر دیکھیے کہ ناصر کاظمی کیسا جاں گداز سانحہ بیان کر رہے ہیں:

نئی دنیا کے ہنگاموں سے ناصر
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی

ایک نیا دور جنم لیتا ہے
ایک تہذیب فنا ہوتی ہے

ایک انوکھی بستی دھیان میں بستی ہے
اس بستی کے باسی مجھے بلاتے ہیں
گُل نہیں مہ نہیں پیالہ نہیں
کوئی بھی یادگارِ رفتہ نہیں

ناصر کاظمی کو تہذیبی ورثے کی تباہی کا غم تو ہے، وہ 'اداس اداس' پھرتے ہیں لیکن ان کے دل میں یہ امید بھی ہے کہ کبھی نہ کبھی 'رفتگاں' کا سراغ مل ہی جائے گا:

مل ہی جائے گا رفتگان کا سراغ
اور کچھ دن پھرو اداس اداس

ان کی زندگی پر اداسی اور محرومی چھائی ہوئی ہے لیکن وہ خواب دیکھنے سے محروم نہیں ہوتے۔ یہ خواب ایک

ایسے انسان کے خواب ہیں جو گہری اداسی کے باوجود خوش آئند خواب دیکھتا ہے۔ ہم اس کو ناصر کی رومانوی آرزومندی بھی کہہ سکتے ہیں جو کبھی اداسی، کبھی جستجو، کبھی محبوبہ سے ملاقات اور کبھی شہرِ نگاراں کی صورت میں نظر آتی ہے۔ ان کا ذہن بنیادی طور پر رومانوی ہے مگر وہ رومانوی جذبات کو حیات کا حاصل نہیں سمجھتے۔ ان کی رومانویت میں بھی ناسٹیلجیا نظر آتا ہے۔

سرخ چناروں کے جنگل میں
پتھر کا ایک شہر بسا تھا
آگ کی محل سرا کے اندر
سونے کا بازار کھلا تھا

خوشبوؤں کی اداس شہزادی
رات مجھ کو ملی درختوں میں

ناصر کی شخصیت رومانویت کے خول میں بند نہ رہی بلکہ یہ پھیلاؤ کی طرف مائل رہی۔ ان کی اس وسعت کا اندازہ ان کے عصری شعور سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے شعور میں بیداری ہے۔ وہ ملکی حالات کی تبدیلیوں کا ادراک رکھتے ہیں۔ تقسیم اور فسادات کے ہول ناک واقعات اور روحانی قدروں اور مادی قوتوں کے تصادم نے متاثر کیا ہے۔

شہر سنسان ہے کدھر جائیں
خاک ہو کر کہیں بکھر جائیں

ناصر کے یہاں ہجرت کا دکھ، اس کی تکلیفوں کا دکھ اور احساس تو ہے ہی، ساتھ ساتھ یہ بھی احساس ہے کہ جس مقصد کے لیے ہجرت کی تھی وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ جس صبح کی بات فیض نے کی تھی، اسی صبح کا انتظار ناصر کو بھی تھا:

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

لیکن ناصر نے امید نہیں چھوڑی۔ ان کا انتظار جاری رہا۔ انھیں یقین تھا کہ مقصد ضرور پورا ہوگا۔

رہ نوردِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر
کارواں پھر ملیں گے صبر کر صبر کر

مایوس نہ ہو اداس راہی
پھر آئے گا دورِ صبح گاہی

ناصر کی ابتدائی شاعری اور ہجرت کے فوراً بعد کی شاعری میں ایک تھکن ہے۔ وہ آس پاس کے ماحول کو دیکھ کر افسردہ ہیں لیکن دیوان کی شاعری میں ان کے اندر ایک توانا امید نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں اداسیوں کی رات کے بعد رجائیت کا سورج طلوع ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو امید دلاتے نظر آتے ہیں:

گہری نیند سے جاگو ناصر
وہ دیکھو سورج نکلا ہے

وقت اچھا بھی آئے گا
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

ان کی شاعری کے آخری حصے میں امید کی جو روشنی اکٹھی ہوگئی تھی، اسے ناامیدی کے اندھیرے نہیں بکھیر سکتے تھے:

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اُسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی

فاطمہ وسیم
اردو شاعری اور شعریات

کراچی کے بارے میں سید محمد جعفری کی مزاحیہ شاعری

تعارف

سید محمد جعفری ۲۷ دسمبر ۱۹۰۵ء کو پہرسر، بھرت پور، ہندوستان کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ڈی اے وی سکول لاہور سے میٹرک کیا اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے کیمسٹری میں بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں ایم اے (فارسی) اورینٹل کالج لاہور سے کیا۔ دوبارہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے اور ایم اے (انگریزی) کی ڈگری حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) میں انگریزی، فزکس اور فارسی ادب کے استاد بھی رہے۔ ۱۹۴۰ء میں برطانوی حکومت کے محکمۂ اطلاعات ونشریات میں شامل ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی گئے اور محکمہ اطلاعات میں اہم منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۶۴ء میں انھیں پریس اور کلچرا تاشی بنا کر تہران بھیج دیا گیا۔ ۱۹۶۶ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور کراچی آ گئے۔ ستر سال کی عمر میں ۷ جنوری ۱۹۷۴ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ادبی خدمات

سید محمد جعفری ایک صاحبِ اسلوب شاعر تھے۔ انھوں نے سیاسی اور سماجی موضوعات پر ۸۳۰ کے لگ بھگ نظمیں تحریر کیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی شاعری کے مجموعے شوخی تحریر، تیر نیم کش اور کلیاتِ سید محمد جعفری شائع ہوئے۔

تجزیہ

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور صنعتی مرکز ہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی آزادی کے وقت اسے دارالحکومت منتخب کیا گیا۔اس وجہ سے شہر میں لاکھوں مہاجرین آئے۔ پاکستان کا دارالحکومت اور بین الاقوامی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے شہر میں صنعتی سرگرمیاں دیگر شہروں سے قبل شروع ہو گئیں۔ پورے پاکستان سے لوگ روزگار کی تلاش میں کراچی آتے تھے اور اس وجہ سے یہاں مختلف مذہبی، نسلی اور لسانی گروہ آباد ہوئے۔ شاعری پاکستانی ثقافت میں گہرائی سے سرایت کر چکی ہے اور اسے فن کارانہ اور فکری تبصرے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ کراچی میں دانش وروں اور شاعروں کی ایک بڑی جماعت ہے جو اپنا کلام پیش کرتے ہیں اور اس کے ذریعے اپنی سوچ اور فکر کو پھیلاتے ہیں۔ شہر میں کام کے بہتر مواقع ملنے کی امید میں شاعروں کی ایک بڑی تعداد بھی کراچی آ گئی۔ شاعری کے مرکزی خیال اور موضوعات بہت مختلف تھے، لیکن زیادہ تر معاشرتی اور ثقافتی تبصرے ہوتے۔ کراچی کے کچھ شاعر قابل ذکر ہیں جن میں سرفہرست ادا جعفری، پروین شاکر، جون ایلیا، فہمیدہ ریاض، عشرت آفرین، انور شعور اور دیگر شامل ہیں۔ اسی طرح کراچی کے بارے میں بہت سی اردو اور انگریزی کتابیں لکھی گئیں۔ کراچی جا لافانی کردار (ترجمہ: کراچی کی نامور شخصیات، تحریر: گل حسن کلمتی)۔ کراچی سے تعلق رکھنے والی تقریباً ۲۵ عظیم شخصیات کے خاکوں پر مشتمل کتاب ہے، جنھوں نے اس شہر کی ترقی میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ اگرچہ کتاب شخصیات کے خاکوں پر مبنی ہے لیکن اسے اس انداز میں ترتیب دیا گیا ہے کہ کراچی کے ارتقا اور ترقی کی تصویر واضح ہو جاتی ہے۔ ایڈیٹرز حمیدہ کھورو اور انور معراج نے *Karachi – Megacity of Our Times* میں بیس ہزار افراد کے ایک نیند کی بستی والے شہر کو ایشیا کے سب سے بڑے شہر میں تبدیل کرنے کی کہانی بتائی ہے۔ *St. Patrick's: A Journey of 175 Years* گورٹی اور مائیکل علی نے لکھی ہے۔ کتاب بنیادی طور پر مختلف دستاویزات کا ایک مجموعہ ہے۔ اس میں تصاویر کا اضافہ کراچی کے ایک تاریخی نشان، اس ورثہ یادگار کی خوب صورتی اور اہمیت کو گہرائی سے سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔

Instant City: Life and Death in Karachi میں سٹیو انسکیپ دسمبر ۲۰۰۹ء میں ایک سنگین دن کا اہم

واقعہ پیش کیا گیا ہے جو کراچی میں جاری فرقہ وارانہ تناؤ پر روشنی ڈالتا ہے۔ جب شیعہ مذہبی جلوس کے ذریعے بم دھماکے ہوئے، جس کے بعد کراچی کے تجارتی ضلع میں سینکڑوں کاروباروں کو نذر آتش کیا گیا۔ کراچی کے باشندوں کے 'کوانٹرویو' کے ذریعے، انسکیپ نے اس خوف ناک دن کی جھلک دکھائی ہے۔

The Scatter Here is Too Great بلال تنویر کی لکھی ایک بہت ہی متاثر کن کتاب ہے۔ مصنف کراچی میں پیدا ہوئے اور ان کی پرورش بھی وہیں ہوئی۔ گندگی، مستقل ٹریفک جام، بہت سارے لوگوں کی دل کشی اور دوسروں کی گھبراہٹ اس کتاب کے ہر صفحے پر نظر آتی ہے۔ آپ واقعی محسوس کرتے ہیں کہ آپ سی ویو میں کچرا پھیلائے ہوئے ساحل سے لے کر بازاروں کی بھڑکتی سڑکوں تک ہیں۔

فکری خیالیہ

اردو کی مزاحیہ شاعری میں نظیرا کبرآبادی کے بعد قابل ذکر ناموں میں سید محمد جعفری بھی شامل ہیں۔ سید محمد جعفری نے اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں پاکستان کی، خاص طور پر کراچی کی سیاسی وسماجی صورت حال کو صحیح تناظر میں دیکھا اور اسے پرکھ کر تجزیہ کی روایت کو فروغ دیا۔ طنز ومزاح کے ایک معتبر ومنفرد شاعر کی حیثیت سے جعفری کی شہرت کا آغاز حقیقتاً قیام پاکستان کے بعد ہوتا ہے۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۷۴ء کے درمیانی عرصے میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے، اسے ان کی شاعری کا بہترین حصہ کہا جاتا ہے۔ سید محمد جعفری کی طنز وظرافت میں جو بے اعتدالیاں موضوع بنی ہیں، ان کا تعلق بیسویں صدی کے سماجی وتہذیبی رویوں سے ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ دیر تک زندہ اور موثر رہنے والی شاعری کی جو صلاحیت اکبر کے طنز وظرافت میں ملتی ہے، وہی سید محمد جعفری کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ سید محمد جعفری کے ذہن کو حصول تعلیم کی طرح حصول معاش کے مسائل نے بھی ان کی زندگی کے مختلف تجربوں سے ہم کنار ہونے کا موقع دیا۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری سنی سنائی باتوں یا خواب وخیال کی دنیا میں نہیں رہتی بلکہ زندگی کے واقعات و حقائق سے متصّل ہے۔

فرمان فتح پوری کہتے ہیں کہ گھر کی فضا نے سید محمد جعفری کے ذہن کو بچپن ہی سے مشرقی تہذیبی روایات سے مانوس کر دیا تھا۔ انھوں نے طنز وظرافت کا نشانہ مختلف معاشرتی مسائل کو بنایا ہے۔ سید محمد جعفری کی بالغ نظری اور ادبی

بصیرت نے ان کے فن کی آب یاری کی ہے۔ وہ نہ صرف معاشرے کی خامیوں اور برائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں بلکہ سوسائٹی کی مفاد پرستی اور بے راہ روی کو بھی بے نقاب کرتے ہیں۔ جتنا عرصہ وہ کراچی میں رہے انھوں نے بہت سی شاعری اس بارے میں کی۔

فنی خصوصیات

سید محمد جعفری کی شاعری میں زبان و بیان کی پختگی اور جامعیت نظر آتی ہے جس کے سبب ان کی شاعری کا دائرہ ان کے ہم عصر مزاح نگار شعرا کے مقابلے میں زیادہ خوب صورت اور وسیع ہو گیا ہے۔ اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ سید محمد جعفری نے ۱۹۰۵ء میں ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا جس میں شعروادب کی روایت کئی نسلوں سے قائم تھی۔

اقبال اور غالب کے مصرعوں اور اشعار کا جیسا خوب صورت اور بامعنی استعمال سید محمد جعفری نے اپنی ظریفانہ شاعری میں کیا ہے، شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ جعفری کے کلام کی ایک خصوصیت و انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں موضوعات کی رنگا رنگی کے ساتھ ساتھ ظرافت کی موجودگی بھی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ طنز و مزاح ان کے ہاں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر نمودار ہوتے ہیں۔ اپنی شاعری میں مزاح کے تیز تیر چلائیں یا طنز کے نشتر چبھائیں، ان کے پیش نظر مریض نہیں ہمیشہ مرض ہوتا ہے۔ تخلیقی ذہن رکھنے والے ایک حساس شاعر کی حیثیت سے انھوں نے شاعری کی ذریعے اپنے دل و دماغ کے بوجھ کو ہلکا کیا دوسری طرف عوام الناس کے خیالات و جذبات کی ترجمانی کر کے انھیں تلخ حالات میں بھی زیر لب مسکراتے رہنے، زمانے کے ستم کو طنز کا نشانہ بنانے اور عزم و حوصلہ کے ساتھ جیتے رہنے پر آمادہ رکھا۔

طریقہ کار

ان کی شاعری کو کلیات سید محمد جعفری کی شکل میں ۱۴ جون ۲۰۱۲ء کو مرتب کر کے انتظار حسین نے نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ یہ سنگِ میل پبلشرز، لاہور سے شائع ہوئی۔ ان کی کتاب شوخی تحریر کا دیباچہ فرمان فتح پوری نے ۲۹ اپریل ۱۹۸۳ء کو لکھا اور تیر نیم کش کا پیش لفظ انتظار حسین ۲۰ جون ۲۰۰۶ء کو تحریر کیا۔ کلیات تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اول: طنز و مزاح کی شاعری، دوم: سنجیدہ کلام، سوم: نعت،

منقبت، قصائد اور مرثیوں پر مشتمل ہے۔ اگر ہم کلیات کے حصہ اول پر غور کریں تو پہلا موضوع ''میرا دیوان'' اور آخری ''عیدالاضحیٰ'' ہے۔ کلیات میں موضوعات کے ساتھ کوئی خاص تاریخی معلومات حاصل نہیں ہوتیں جس سے ہمارے علم میں اضافہ ہو کہ کون سی نظم کب لکھی گئی ہے۔ طنز و مزاح کے حصے میں کراچی شہر کو انھوں نے اپنا موضوع بنایا اور اس کے بارے میں ان کئی نظمیں ملتی ہیں۔ کلیات کے مطابق جن نظموں کے عنوان میں کراچی کا لفظ آ رہا ہے وہ کل بارہ ہیں:

۱۔ کراچی سے لاہور بذریعہ تیز گام
۲۔ کراچی کی صنعتی نمائش
۳۔ کراچی میں بارش
۴۔ کراچی کا ٹریفک
۵۔ کراچی
۶۔ کراچی کے مچھر
۷۔ کراچی (مختلف نظم، یکساں عنوان)
۸۔ کراچی کی سڑکیں
۹۔ کراچی کا مسئلہ
۱۰۔ کراچی میں شادیاں
۱۱۔ کراچی میں ملیریا
۱۲۔ کراچی کا موسم

اس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ دو مختلف نظموں کا ایک ہی عنوان ہے مثال کے طور پر ''کراچی'' اور کہیں نظموں کا مرکزی خیال ایک جیسا ہے مگر نظم کا عنوان تھوڑا سا مختلف ہے مثال کے طور پر ''کراچی میں ملیریا'' اور ''کراچی کے مچھر''۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری نظموں میں بھی کراچی کا ذکر آتا ہے اگرچہ پوری نظم اس کے بارے میں نہیں۔

کراچی پر مزاحیہ شاعری

اب ہم سید محمد جعفری کی مزاحیہ نظموں سے لیے گئے چند اشعار پر روشنی ڈالتے ہیں:

اے کراچی تیری رونق اور شہروں میں کہاں
مچھروں کی بین الاقوامی نمائش ہے یہاں
کس قدر آباد ہیں تیری نواحی بستیاں
ان میں مچھر میہماں ہیں اور مچھر میزبان
مچھروں کے شہر میں حفظان صحت کا نظام
کر رہا ہے پوری تن دہی سے اپنا کام

کراچی کے مچھر نظم میں کراچی کے ماحول کے بارے میں بات کی گئی ہے کہ یہاں پہ ہر قسم ہر نسل کا مچھر پایا جاتا ہے۔کراچی اب مکھیوں کی بھیڑ سے دو چار ہے۔کیڑے ہر محلے، بازار اور دکان میں ہر جگہ نظر آتے ہیں اور کسی کو بھی نہیں بخشتے۔ وہ فٹ پاتھوں، اسٹورز اور کاروں اور گھروں سے باہر اور سبزیوں سے لے کر لوگوں تک، ہر سطح پر دست یاب ہیں۔ وہ یہاں طنز کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ مچھروں کی باتوں اور حرکتوں کی رونق ہر طرف لگی ہوئی ہے۔شہر میں اتنی آلودگی ہے اور گندا پانی کھڑا ہے جس میں مچھر پیدا ہو رہے ہیں۔شہر کی آلودگی مچھر کی نشو و نما کا سبب بن رہی ہے اور بیماریاں پروان چڑھ رہی ہیں جس کی بہ دولت شہر میں صحت کی صورت حال بہت زیادہ خراب ہے اور عوام کو معدے کی اور طرح طرح کی بیماریاں لگ رہی ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کراچی ہے جو مفقود الخبر
اس کو لے جائیں گے کچھ کار اب دیکھیں کہ کدھر
اے کراچی ہوشیار اب منزلوں میں ہے خطر
تو ہے بھولا بھالا اور رہزن ہیں تیرے ہم سفر
بولنے والا نہیں کوئی کہ سب ہیں بے زباں
آدمی سب چل دیئے باقی ہیں بھیڑ اور بکریاں

کراچی ایک وقت میں پاکستان کا دارالحکومت تھا اوراس کی بندرگاہ میں بہت زیادہ تجارت ہوتی تھی۔اس شہر میں سرمایہ کاری بہت زیادہ تھی جس کی وجہ سے بیرون ملک تجارتی تعلقات پروان چڑھے لیکن اس کے برعکس اب کراچی کو کوئی نہیں پوچھتا اور یہ جگہ لاوارث ہوتی جارہی ہے۔ یہ خوب صورت شہر نہ صرف نادان لوگوں کے ہاتھوں برباد ہورہا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ چوراور ڈاکو اس کے خزانے کو بھی لوٹ رہے ہیں۔جعفری کراچی کے رہنے والوں کو خبردار کررہے ہیں کہ راستوں پر بازاروں پر لوگ ہوشیار ہوجائیں اور محتاط رہیں کہ کہیں بھی ڈاکوؤں اور چوروں کا حملہ ہوسکتا ہے۔لٹیرے لوگوں کی معصومیت کا ناجائز فائدہ اٹھارہے ہیں۔اس کے ساتھ شاعر کراچی کے لوگوں کو طنز کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ تم سب خاموش ہوکر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھو بلکہ کچھ کرو۔تم بھیڑ بکریوں کی مانند ہوگئے ہو جو حکمرانوں کی اندھی پیروی کررہے ہو۔اس رویے کو ختم کرکے آگے بڑھو اور بہتری کی طرف قدم بڑھاؤ:

شہر کراچی کو سڑکوں نے یوں مل کر بد نام کیا
ٹھیکیدار نے ان پر کالک ملنے کا اقدام کیا
بادل پر سے میکپ دھویا، راز کو طشت از بام کیا
''الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا''
دیکھا اس بیماری ''زر'' نے آخر کام تمام کیا

سڑکوں کی خراب حالت لوگوں کو بے حد تکلیف کا باعث بنتی ہے،جس کی وجہ سے دفتری اوقات میں ٹریفک جام رہتا ہے اور حادثات پیش آتے ہیں۔کچرے کے ڈھیر سڑکوں پر ہر جگہ دیکھے جاسکتے ہیں۔سڑکوں پر کوڑے سے بدبو آتی ہے اور سڑکوں پر گڑھے ہیں جس سے سفر کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔بارش سے نالے بھر جاتے ہیں اور نکاسی آب کے ناقص نظام کے نتیجے میں سڑکوں پر پانی بھر جاتا ہے جس کے نتیجے میں انھیں نقصان ہوتا ہے۔اس خراب نظام نے بہت ساری مہلک بیماریاں بھی پیدا کیں اور ماحول کو آلودہ اور سڑکوں کی خوب صورتی کو تباہ کردیا ہے۔ سڑکوں کی خراب صورت حال کی وجہ سے سارا ٹرانسپورٹ سسٹم بری طرح متاثر ہورہا ہے۔انھوں نے یہاں میر تقی میر کا حوالہ

بھی دیا ہے:

میں ہوں ایک پرانا مقامی مہاجر
کہ دنیائے فانی میں سب ہیں مسافر
میں بیکار تھا پہلے اب ہوں میں تاجر
میں کرتا ہوں وعدہ یہ ملت کی خاطر
اگر چور بازار سے کچھ کماؤں
تو اک سنگ مرمر کی مسجد بناؤں

نظم ''ابن الوقت'' میں کراچی کے مہاجر لوگوں کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے کہ انھوں نے یہاں رہ کر کراچی کے خزانوں کو اپنے مفاد کے لیے پامال کیا ہے اور اسی کے بہ دولت ان کا شمار امیر لوگوں میں ہو گیا ہے۔ جن لوگوں کے ہاتھ پہلے خالی تھے؟ اب وہی ملک وقوم سے وعدے کر رہے ہیں کہ قوم کے ان پیسوں سے مسجد کی تعمیر کریں گے۔ یہاں انھوں نے طنزیہ انداز میں بیان کیا ہے کہ ناجائز طریقے سے کمایا ہوا پیسہ ایک نیک کام میں خرچ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اپنی شاعری میں انھوں نے طنز کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ لوگوں کو شعور دیا کہ وہ اپنی اصلاح کریں۔ جعفری نے اپنی شاعری کے ذریعے کراچی کے لوگوں کو خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے معاشرے کی ناہمواریوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنا کر لوگوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔

سید محمد جعفری اپنی طنز و مزاح کی شاعری کے ذریعے لوگوں کو بیدار کرنے میں کسی حد تک کامیاب رہے۔ اگر آج کراچی کی صورت حال کو دیکھا جائے اور ان کی شاعری کو سامنے رکھا جائے تو کراچی کے حالات کچھ جگہوں پر بہتر ہوئے ہیں۔ سٹریٹ کرائمز، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کم ہوئی ہے مگر کچھ مسائل ابھی بھی قابل توجہ ہیں جیسے آلودگی اور ناقص سرکاری نظام۔ ضرورت ہے کہ محنت اور دیانت داری سے ان مسائل کا قابلِ عمل حل تلاش کیا جائے۔ سید محمد جعفری کی شاعری اس معاملے میں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔

محمد علی

اردو شاعری اور شعریات

جون ایلیا: فکر و فن

جون ایلیا کی شخصیت کا نقشہ ان کے دوست قمر رضی نے اس طرح پیش کیا ہے: ''ایک زود رنج مگر بے حد مخلص دوست، اک شفیق اور بے تکلف استاد، اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا راہ گیر، اک مرعوب کن شریک بحث، ایک مغرور فلسفی، اک فوراً رو دینے والا غمگسار، ناروا حد تک خوددار اور سرکش عاشق، ہر وقت تمباکو نوشی میں مبتلا رہنے والا خلوت پسند، انجمن ساز، بہت ہی ناتواں مگر ساری دنیا سے بہ یک وقت جھگڑا مول لے لینے کا خوگر، سارے زمانے کو اپنا محرم بنا لینے والا نامحرم، حد درجہ غیر ذمہ دار، ایک شدید الحس نادرہ کار شاعر، یہ ہے وہ فن کار جسے جون ایلیا کہتے ہیں۔'' ذیل میں ان کی فکر و فن کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

جون ایلیا کے موضوعات

جون ایلیا کی شاعری کا ایک اہم موضوع رومانیت ہے۔ ان کی رومانوی شاعری میں کلاسیکیت کے ساتھ ساتھ عشق و رومان کے عصری تقاضے بھی نظر آتے ہیں۔ جون ایلیا کا تجربۂ عشق روایتی نہیں ہے۔ وہ محبوب کی ناز برداریوں میں مشغول نہیں نظر آتے بلکہ وہ محبوب کو نظر انداز بھی کرتے ہیں، محبوب کو تکلیف میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، محبوب کی شکل بھول جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے موضوعات ناصر کاظمی اور فراق گورکھ پوری وغیرہ کی روایت ہی کا تسلسل ہیں۔ ان کے کچھ اشعار بہ طور مثال ملاحظہ کیجیے:

ایذا دہی کی داد جو پاتا رہا ہوں میں
ہر ناز آفریں کو ستاتا رہا ہوں میں

خود ہی وہ آ گیا تھا دل کے قریب
ہم ہیں مارے ہوئے سہولت کے

وہ مضامین جو جون سے پہلے ناصر کاظمی اور فراق اپنی غزلوں میں باندھ چکے ہیں وہی مضامین، اور کچھ نئے مضامین جون نے اپنے انداز سے باندھے ہیں۔مثلاً محبوب سے فرقت پر خوشی کا اظہار، محبوب کی ملاقات میں کسی اور کی کمی، اپنے محبوب پر شکوک وشبہات وغیرہ۔مثال ملاحظہ کیجیے:

عجیب ہے میری فطرت کہ آج ہی مثلاً
مجھے سکون ملا ہے ترے نہ آنے سے

زمانہ تھا وہ دل کی زندگی کا
تری فرقت کے دن لاؤں کہاں سے

تو ہے پہلو میں پھر تیری خوشبو
ہو کے باسی کہاں سے آتی ہے

غرض جون کے یہاں مختلف مضامین ایسے ملتے ہیں جو غزل کے دامن کو وسیع کرتے ہیں اور روایتی غزل سے انحراف کے طور پر بھی سامنے آتے ہیں۔

جون ایلیا فلسفیانہ بصیرت کے مالک شاعر تھے۔اوائلِ عمر سے ہی ان کو فلسفے میں دل چسپی رہی تھی۔انھوں نے دنیا کے تمام مشہور اور تقریباً ہر فلسفی کو پڑھا۔انھوں نے مدرسوں میں فلسفہ منطق وغیرہ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں ان کا علم موج زن نظر آتا ہے۔ وہ کائنات کی ہر شے پر بحث کرتے ہیں اور اپنا نظریہ قائم کرتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں خدا، ذات و کائنات اور زندگی کے موضوعات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے:

زندگی کیا ہے اک ہنر کرنا
سو قرینے سے زہر پیجیے گا

جو گزاری نہ جا سکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

تصورِ خدا کے بارے میں چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

خدایا ترے حسنِ تقویم میں ہم
تضادِ وجود و عدم دیکھتے ہیں

اے خدا جو کہیں نہیں موجود
کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں

جو کہیں بھی نہ ہو، کبھی بھی نہ ہو
آپ اس کو خدا سمجھ لیجے

جون ایلیا کے کلام میں یقین و گمان کی کش مکش بھی بہت اہم مقام رکھتی ہے۔ وہ فلسفہ کے دقیق مطالعہ کی وجہ سے تشکیک کا شکار ہوئے، جس کا اظہار انھوں نے خود کیا ہے: ''میں فلسفے کا مطالعہ کرنے کے نتیجے میں اپنی تمام تر یقینیات سے محروم ہو گیا۔''

اس ذہنی تصادم نے ان کو لاادریت میں مبتلا کر دیا جس سے ایسی کرب ناک صورت پیدا ہو گئی کہ ان کو خود کے موجود ہونے پر بھی یقین نہیں رہا۔ جون فلسفے کے اس گہرے مطالعے کے نتیجے میں بے یقینی، فکری ہجوم اور کثرتِ اوہام کا شکار ہو کر نفی پسندی کی طرف شدت سے مائل ہو گئے:

پڑے ہیں ایک گوشے میں گماں کے
بھلا ہم کیا ہماری زندگی کیا

میں ہوں بھی یا نہیں ہوں عجب ہے مرا عذاب
ہر لمحہ ''یا'' کے ساتھ ہوں، تم کس کے ساتھ ہو؟

جون ایلیا کے مزاج میں ہر چیز سے انکار تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے خدا کے اور خود اپنی ذات کے وجود

سے انکار کر دیا۔ وہ معاشرے کے ہر ضابطے اور قاعدے کی نفی کرتے رہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''میں اپنے مزاج میں شروع سے ایک نفی پسند (Nihilist) اور فوضوی (Anarchist) تھا اور کسی بھی ضابطے اور قاعدے کو تسلیم نہیں کرتا تھا''

جس کو بھی شیخ و شاہ نے حکمِ خدا دیا قرار
ہم نے نہیں کیا وہ کام ہاں بہ خدا نہیں کیا

جون کی شاعری کا ایک بنیادی پہلو داخلی نفسیات کی ترجمانی ہے۔ ان کی شاعری میں اپنی ذات کی تنہائی، لوگوں سے بے زاری، باطنی صدائیں، یاسیت وقنوطیت وغیرہ کے موضوعات نمایاں نظر آتے ہیں۔

میں اب ہر شخص سے اکتا چکا ہوں
فقط کچھ دوست ہیں، اور دوست بھی کیا

جون ساری زندگی اپنے شدید انا پرست اور پر غرور رویے کے باعث تنہا رہے۔ کسی نے ان کا ساتھ زیادہ دیر تک نہیں نبھایا۔ ان کا شعر ہے:

ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے
جس سے ملیے اسے خفا کیجے

انھوں نے اپنی اس خارجی اور داخلی تنہائی کو شاعری میں بیان کیا ہے۔

ہم تو اپنی تلاش میں اکثر
از سما تا سمک گئے ہوں گے

اتنا خالی تھا اندروں میرا
کچھ دنوں تو خدا رہا مجھ میں

مستقل بولتا ہی رہتا ہوں
کتنا خاموش ہوں میں اندر سے

اپنے انشائیے ''سیراب'' میں اپنی تنہائی کے متعلق لکھتے ہیں: ''میں تو اپنے ہی اندر بولتے بولتے اتنا تھک

گیا ہوں کہ مجھے اپنے سینے کو سکھ پہنچانے کے لیے موت سے بھی زیادہ کوئی لگاتار خاموشی چاہیے۔‘‘

آپ اپنے سے ہم سخن رہنا
ہم نشیں! سانس پھول جاتی ہے

میں رہا عمر بھر جدا خود سے
یاد میں خود کو عمر بھر آیا

جون ایلیا کے ہاں ترقی پسند شاعری جیسی نشاطیہ کیفیت نہیں ہے۔ ان کے یہاں بے زاری ہے، ناآسودگی ہے۔ ان کی شاعری میں یاسیت و قنوطیت ہے اور کہیں کہیں رجائیت بھی۔ ایک طرف کہتے ہیں:

خواب و خیال و وہم و گماں کچھ نہیں بچا
کیا پوچھتے ہو دل کا زیاں کچھ نہیں بچا

دوسری طرف کہتے ہیں:

مر نہ جاتے تو اور کیا کرتے
بے تمنا جیا گیا ہی نہیں

کمال احمد صدیقی کے بہ قول: ’’قنوطیت و رجائیت کا ایک عجیب سنگم ہے اور یہ سنگم ایک paradox ہے‘‘۔

کوئی امید دلاؤ کہ آرزو تو رہے
نظر اٹھے نہ اٹھے دل ہی کچھ ٹھہر جائے
قدم اٹھیں نہ اٹھیں کوئی جستجو تو رہے
ہو چارۂ غمِ جاں کیا یہ گفتگو تو رہے

ان کی المیہ شاعری کا سب سے بڑا سبب ہجرت ہے۔ جون ایلیا کی شاعری میں اپنے وطن امروہہ سے ہجرت کا دکھ نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں تقسیم کے وقت فسادات کا دکھ اور اس بات کا دکھ، کہ جس مقصد کے لیے ہجرت کی وہ مقصد پورا نہ ہوسکا، بہت نمایاں ہے۔ اس دور کے اکثر شعرا کی طرح جون نے بھی ہجرت کا کرب، نئے شہر میں اجنبیت کا احساس، ماضی کی یادیں وغیرہ جیسے موضوعات بیان کیے ہیں:

وہ جو تعمیر ہونے والی تھی
لگ گئی آگ اس عمارت میں

بہت بدحال ہیں بستی ترے لوگ
تو پھر تُو کیوں سنواری جا رہی ہے

وہ جو اپنے مکان چھوڑ گئے
کیسے دنیا جہان چھوڑ گئے

تری بانھوں سے ہجرت کرنے والے
نئے ماحول میں گھبرا رہے ہیں

انھوں نے اس ہجرت کے کرب کو جس شدت سے محسوس کیا اسی شدت سے الفاظ میں بیان کر دیا۔

جون ایلیا کا اسلوب

جون ایلیا کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں بھرپور کیفیات، جذبات کی فراوانی، ندرتِ خیال کے ساتھ اسلوب کی جدت اور طرزِ اظہار کی دل کشی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی چیدہ چیدہ خصوصیات درج ذیل ہیں۔

جدید شاعری میں علامت نگاری ایک رجحان کے طور پر سامنے آئی۔ جون ایلیا کے ہاں بھی علامت نگاری کا رجحان ملتا ہے، لیکن وہ اکثر علامت نگاری کی بجائے بہ راہ راست اظہار کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی شاعری سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شاعری میں محض بڑے اور اعلیٰ مضامین ہی نہیں بلکہ عام زندگی کے مضامین بھی شاعرانہ فن کاری سے نظم کیے جا سکتے ہیں۔ چند اشعار بہ طورِ مثال ملاحظہ ہوں:

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

اس شعر میں گھر کو ذات کی علامت بنایا گیا ہے۔ جون نے گھر کے علاوہ شہر اور شہر کے متعلقات کا بھی بہ طورِ علامت

بہت استعمال کیا ہے جوان کے وطن سے جدائی اور ہجرت کے کرب کو ظاہر کرتی ہیں۔

لٹا دے نیند کے بستر پہ اے رات!
میں دن بھر اپنی پلکوں پر رہا ہوں

جدید شاعری میں رات درد والم کی، دن خوشی و اطمینان کی اور نیند آرام وسکون کی علامت ہے۔ اس شعر میں یہ تینوں الفاظ تقریباً اسی مفہوم میں ادا ہوئے ہیں۔ لیکن رات سے نیند کے بستر پر لٹانے کی بات یعنی دکھ اور تکلیف میں آرام و سکون کی توقع ایک ایسا خیال ہے جس نے اس شعر میں ندرت پیدا کر دی ہے۔

انھوں نے عام جدید شعرا کی طرح ہی لفظیات کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان میں کوئی نئی بات محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ ان عام علامتوں میں ان کا اندازِ بیاں بہت منفرد ہے اور اسی سے ان کے اشعار میں نیا پن محسوس ہوتا ہے اور ان علامات میں نئی معنویت پیدا ہوتی ہے۔

متروک الفاظ کا استعمال

جون ایلیا نے اپنی شاعری میں اردو کے بعض متروک الفاظ کو استعمال کیا اور انھیں دوبارہ زندگی بخشی۔ مثلاً نئیں، بسترا، جائیو، آئیو غیرہ۔ مثال ملاحظہ ہو:

تو اگر آئیو تو جائیو مت
اور اگر جائیو تو آئیو مت

اس کے علاوہ جون نے ایک شعر میں لفظ ''چاندنا'' استعمال کیا ہے جو اتر پردیش میں سورج نکلنے کے فوراً بعد کے اجالے کو کہتے ہیں۔ جون نے علاقے میں رائج اس لفظ کو خوب صورتی کے ساتھ نظم کیا ہے۔

صحنِ خیالِ یار میں، کی نہ بسر شبِ فراق
جب سے وہ چاندنا گیا، جب سے وہ چاندنی گئی

ایک شعر اور ملاحظہ کیجیے:

شش جہت آئنوں کے بیچم بیچ
تو نے اپنی وہ بے رخی کیا کی؟

یہ ''پیچم پیچ'' کے لفظ کا نادر استعمال جون کے سوا کون کرسکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ کے استعمال کے بعد اگر اس کے بجائے پیچوں پیچ استعمال کریں تو شعر کا لطف ہی ختم ہوجاتا ہے۔

جون ایلیا شعر میں لفظوں کی تکرار سے بھی حسن پیدا کرتے ہیں اور یہ تکرار عموماً شعر کی خوب صورتی میں اضافہ کرتا ہے:

اُس کی گلی سے اٹھ کے میں آن پڑا تھا اپنے گھر
ایک گلی کی بات تھی اور گلی گلی گئی

اس شعر میں ''گلی'' کے بار بار استعمال سے حسن پیدا ہوگیا ہے۔ درج بالا شعر میں ایک خاص بات اور ہے اور وہ یہ کہ گلی کی تکرار کے باوجود ہر بار اپنا الگ مفہوم ادا کر رہا ہے۔ جون ایلیا کو الفاظ کی تکرار اور ردوبدل سے خاص تعلق تھا۔ وہ کہیں مصرعہ اول کے الفاظ مصرعہ ثانی میں جن کے توں الٹ دیتے ہیں یا کہیں کچھ ردوبدل کے ساتھ مصرعہ ثانی لکھتے ہیں مثلاً:

یہ آرزو کا فسوں زارِ جاودانہ کیا
نہ آرزو نہ فسوں زارِ جاودانہ ہے

جون ایلیا کے اس طرح کے اشعار عام قاری کو تو متاثر اور لطف اندوز کرتے ہیں مگر ان میں کوئی خاص مفہوم موجود نہیں ہے۔

جون ایلیا کے ہاں ترکیب سازی کا عمل باضابطہ وسیع پیمانے اور منظم طور پر نظر آتا ہے۔ انھوں نے نت نئی تراکیب وضع کی ہیں جو کہ عموماً فارسی آمیز ہیں۔ جون ایلیا نے ہر تیسرے چوتھے شعر میں کوئی ترکیب استعمال کی ہے۔ ان کی استعمال کردہ تراکیب میں نیاپن اور انوکھاپن دیکھ کر منہ سے بے ساختہ سبحان اللہ نکلتا ہے۔ ان کی استعمال کردہ کچھ تراکیب بہ طورِ مثال پیش کی جاتی ہیں۔ التفاتِ مجرمانہ، امہاتِ یقین، اندرونِ حصارِ خاموشی، آسمانِ خاموشیِ جاوید، بے رونقیٔ محفلِ یاراں، پاسِ وضعِ خرد، پرتوِ زخمِ خوں چکاں، پیرایۂ تبسم، پیرِ مغان و رند و قلندر، تضادِ وجود و عدم۔

جون ایلیا نے اپنی شاعری میں تراکیب کا استعمال بہت زیادہ کیا ہے اور انھوں نے اس بات کا بھی خیال

رکھا کہ یہ تراکیب بامعنی، خوش آہنگ اور نئی ہوں۔ مذکورہ بالا چند تراکیب سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ جون ایلیا نے یہ تراکیب وضع کرنے میں عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ ان تراکیب پر پروفیسر منظر عباس نقوی کی رائے ملاحظہ کیجیے: ''ان کی فارسی ترکیبوں میں بڑی جدت طرازی اور نادرہ کاری پائی جاتی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کے تخلیقی استعمال پر انھیں کیسی بے پناہ قدرت حاصل ہے۔''

شکستِ اعتمادِ ذات کے وقت
قیامت آ رہی تھی، آ گئی کیا

اب تو نہیں لذتِ ممکنِ شوق بھی نصیب
روز و شبِ زمانۂ شوقِ محال پر سلام

کہیں کہیں جون نے پورے مصرعے میں ترکیب استعمال کی ہے۔ مثلاً:

سرودِ آتشِ زرّینِ صحنِ خاموشی
وہ داغ ہے جسے ہر شب جلانے لگتے ہو

جون ایلیا کا ان تراکیب کے استعمال میں ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ ان تراکیب کو باقی الفاظ اور ان کے پس منظر کی مناسبت سے نظم کرتے ہیں جس سے ان کے اشعار میں لفظی توازن قائم رہتا ہے اور معنی کو مزید مضبوط کر دیتا ہے۔

اردو شاعری میں دور قدیم سے ہی صنائع بدائع کا نمایاں مقام رہا ہے۔ اکثر کلاسیکی شعرا نے شعر کے آرائشی اوصاف کی جانب خاص توجہ دی اور اُس دور میں شاعری میں فنی محاسن اور حسنِ ادا کو فوقیت حاصل تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس اسلوب میں تبدیلی آتی گئی اور اب جدید شاعری میں ارادتاً شعر میں صنائع بدائع کا استعمال عیب شمار ہوتا ہے اور جدید شاعری میں جو صنائع بدائع نظر آتے ہیں وہ ارادتاً کے بجائے فطرتاً ہیں۔ جون ایلیا نے اپنے کلام میں فنی محاسن کو خوب صورتی سے برتا ہے لیکن ہمیں صنائع بدائع کے بے جا استعمال سے اجتناب نظر آتا ہے۔

کلاسیکی شاعری میں تشبیہات کا عام رواج رہا ہے، اس کے برعکس جدید شاعری میں استعارات کی طرف خاص توجہ ہے۔ جون ایلیا کی شاعری کا جائزہ لینے کے بعد بہت تھوڑے اشعار ملتے ہیں جن میں تشبیہ استعمال ہوئی

ہے۔انھوں نے جوبھی تشبیہات استعمال کی ہیں ان میں کوئی بھی ارادتاً برتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ بہ قول جون ایلیا:

بات تشبیہ کی نہ کیجیے تو
دہر ہے صرف استعاروں کا

جون ایلیا کی یہ بات جدید شاعری پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ چوں کہ استعارہ معنی کو محدودیت سے نکالتا ہے۔لہٰذا جدید شاعری میں تشبیہ کی بجائے استعارات اور علامات کا رجحان عام ہوا۔

اڑے جاتے ہیں دھول کی مانند
آندھیوں پر سوار تھے ہم تو

جون ایلیا کے یہاں استعارے کا عمل بھی بہت دل کش نظر آتا ہے۔انھوں نے اپنے اشعار میں خوب صورت استعارات استعمال کیے ہیں اور بعض استعاراتی نظمیں بھی کہی ہیں جن میں ''اذیت کی یادداشت'' نمایاں ہے۔ان کی غزلوں کے چند اشعار بہ طور مثال ملاحظہ ہوں:

ہے سلسلہ عجب کچھ اس خلوتی سے اپنا
سب اس کے گھر چلے ہیں ہم اپنے گھر چلے ہیں

'خلوتی' یہاں خدا کا استعارہ ہے۔

تو اے بادِ خزاں اس گُل سے کہیو
کہ شاخ اُمید کی اب تک ہری ہے

'گل' ادھر محبوب کا ہی استعارہ ہے اور روایتی ہے لیکن جون نے اس کو رعایت لفظی سے خوب صورت بنایا ہے۔

جون نے اپنی شاعری میں خوب صورت تلمیحات بھی استعمال کی ہیں۔تلمیحات کے الفاظ بہ ظاہر مختصر ہوتے ہیں لیکن ان کے پیچھے وہ پورا واقعہ ہوتا ہے جو شاعر بتانا چاہتا ہے۔اس صنعت کو جون نے بہ خوبی استعمال کیا ہے۔شعر ملاحظہ ہو:

وہ ایک عجیب زلیخا ہے یعنی بے یوسف
ہمارے مصر میں اس کی مثال ہے بھی نہیں

جون کی شاعری میں صنعت تضاد کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں اس صنعت کو بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔مثال ملاحظہ کیجیے:

اب کون زخم و زہر سے رکھے گا سلسلہ
جینے کی اب ہوس ہے ہمیں، ہم تو مر گئے

جون ایلیا کی شاعری میں ہمیں خوب صورت پیکر تراشی کی مثالیں بھی نظر آتی ہیں۔شعر ملاحظہ کیجیے:

اس گلی نے یہ سن کر صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

پیکر کشی کے ساتھ ساتھ جون نے منظر کشی بھی بہت عمدہ کی ہے۔ان کی نظموں ''جشن کا آسیب''، ''اجنبی شام''، ''وقت''،''فیصلہ'' وغیرہ میں دل کش منظر کشی نظر آتی ہے۔جون ایسے منظر کشی کرتے ہیں کہ لمحہ بھر میں تمام مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔مثال ملاحظہ کیجیے:

تنہائی کا ایک جنگل ہے سناٹا ہے اور ہوا
پیڑوں کے پیلے پتے ہیں نغمہ سرائے شامِ خزاں

جون ایلیا نے اپنے اشعار میں دل چسپ محاورات سے شعری حسن اور معنویت بڑھانے کی کامیاب کوشش کی ہے:

کیا کیا نہ خون تھوکا میں اس گلی میں یارو
سچ جاننا وہاں تو جو فن تھا رائگاں تھا

جون نے اپنے کلام میں بارہا ''خون تھوکنا'' محاورہ استعمال کیا ہے۔یہ محاورہ ان کی زندگی کی مشکلات کی علامت ہے۔اس کے علاوہ بھی انھوں نے کئی محاوروں سے شاعری میں حسن پیدا کیا ہے۔مثلاً:

ترے عدم کو گوارا نہ تھا وجود مرا
سو اپنی بیخ کنی میں کمی نہ کی میں نے

جون کے کلام کی ایک اہم خوبی ان کا استفہامیہ انداز ہے جو ان کی ذہنی اور فکری پختگی کا ثبوت ہے۔انھوں

نے کیوں، کیسے، کب، کہاں جیسے الفاظ کو بہت سنجیدگی سے نظم کیا ہے۔ عام طور پر ان کے ایسے اشعار ان کی فلسفیانہ عظمت کا بھی ثبوت ہیں کیونکہ ان میں وہ زندگی، حیات و کائنات، وجود و عدم کے مسائل اٹھاتے نظر آتے ہیں۔

باز آ جایئے کہ سب فتنے
آپ کی کیوں کے اور کیا کے ہیں

ایسے فلسفیانہ سوالات اور اتنی شدت سے یہ سوالات ہمیں غالب کے سوا کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتے۔

جون ایلیا کا مکالماتی انداز ان کی شاعری میں بہت نمایاں ہے اور مشاعروں میں ان کی طرزِ ادا کے باعث ان کے لہجے کی انفرادیت مزید واضح ہو جاتی ہے۔ ان کے ہاں مکالمہ بھی ہے اور کہیں یہ مکالمہ خود کلامی کے انداز میں بھی سامنے آتا ہے۔ اس ضمن میں یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

یہ غم کیا دل کی عادت ہے؟ نہیں تو
کسی سے کچھ شکایت ہے؟ نہیں تو

یہ بھی دیکھیے:

تم نے مجھ کو لکھا ہے میرے خط جلا دیجے
مجھ کو فکر رہتی ہے آپ انھیں گنوا دیجئے

آپ کا کوئی ساتھی دیکھ لے تو کیا ہوگا
دیکھیے میں کہتی ہوں یہ بہت برا ہوگا

درج بالا امثال کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جون ایلیا مکالمہ کو مصرعوں میں ڈھالنے کے فن میں درجۂ کمال تک پہنچے ہوئے ہیں۔

جون ایلیا نے عام اور سادہ زبان میں اس طرح کے اشعار بھی کہے ہیں جو فوراً قاری کے تجربات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ ان کے اس طرح کے اشعار معنی آفرینی کی بہترین مثال ہیں۔ وہ باریک سے باریک نفسیات اور تجربات کو شعریت میں ڈھالنے میں ماہر تھے۔ مثال ملاحظہ ہو:

ہم نے جانا تو ہم نے یہ جانا
جو نہیں ہے وہ خوب صورت ہے
کتنی دل کش ہو تم کتنا دلجو ہوں میں
کیا ستم ہے کہ ہم لوگ مر جائیں گے

اس بحث سے جون کی فکروفن کے کچھ پہلو ہمارے سامنے آئے ہیں۔ان کی شخصیت اورشاعری کی بہت سی جہات مزید سینکڑوں صفحات کی متقاضی ہیں۔ یہاں ریختہ کی ویب سائٹ پرموجودان کے بارے میں یہ الفاظ برڑے برمحل معلوم ہوتے ہیں:''جون بڑے شاعر ہیں تو اس لئے نہیں کہ ان کی شاعری ان تمام کسوٹیوں پر پوری اترتی ہے جو صدیوں کی شعری روایت اور تنقیدی معیارات کے تحت قائم ہوئی ہے۔ وہ بڑے شاعر اس لئے ہیں کہ انسان کی جذباتی اورنفسیاتی کیفیات پر جیسے اشعار جون ایلیا نے کہے ہیں، اردو شاعری کی روایت میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔''

نیہا عابد
اردو شاعری اور شعریات

نسرین انجم بھٹی

اپنے عہد کی منفرد شاعرہ نسرین انجم ۲۶ جنوری ۱۹۴۳ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئیں۔ابتدا میں سندھ سکول سے پڑھا، ایف اے سکھر سے کیا۔ذہین ترین طالبات سے تھیں، BNR سے وظیفہ حاصل کیا۔پھر نیشنل کالج آف آرٹس، لاہور میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۵ء میں ایم اے اردو کیا۔ ۱۹۷۱ء میں ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئیں اور اس ادارے کی پہلی خاتون ڈائریکٹر جنرل قرار پائیں۔ان کی عادت تھی کہ وہ روٹی پکانے کے بعد کوئلے سے دیواروں پر شاعری کرتیں اور صبح اسے کاغذ پر لکھ لیتیں۔انھیں موسیقی کا بھی شوق تھا اور مصوری بھی کرتی تھیں۔ان کی شادی ۱۹۷۷ء میں زبیر رانا سے ہوئی جو خود بھی لکھنے لکھانے سے وابستہ تھے۔وہ روزنامہ جنگ میں صحافی تھے اور کئی کتابیں لکھ چکے تھے۔

نسرین انجم ایک ترقی پسند خاتون تھیں۔وہ ڈاکٹر سجاد رضوی (جو اورینٹل کالج کے زمانے میں مغربی تنقید کی تعلیم دیتے تھے) سے بہت متاثر تھیں۔جب انھوں نے مقالہ لکھا تو ڈاکٹر عبادت بریلوی ان کے نگران تھے اور انھیں کی طرح ترقی پسند اور جدید نظریات کی حامل شاعرہ شائستہ حبیب ان کی بہترین دوست تھیں۔دونوں نے فہیم جوزی کے ساتھ مل کے اپنا ایک ادبی حلقہ بنا رکھا تھا۔

انھیں اپنے منفرد ترقی پسند خیالات اور مثبت سوچ کی وجہ سے قدامت پسند سوچ رکھنے والوں کی مخالفت کا بہت سامنا کرنا پڑا۔لیکن چوں کہ وہ بہت حوصلہ مند اور بہادر خاتون تھیں سب کا ڈٹ کر سامنا کیا۔نسرین انجم بھٹی بہت سی زبانوں سے واقف تھیں۔وہ پنجابی اور سندھی پر عبور رکھتی تھیں۔جی ایم سید کی یادداشتوں کو سندھی اور اردو میں ترجمہ کیا۔اکادمی ادبیات پاکستان اور رائٹرز گلڈ اور پنجابی ادبی اداروں کی رکن بھی رہیں۔ہمیشہ پس ماندہ لوگوں کی

بہتری کے بارے میں سوچتی تھیں۔خود بھی انتہائی سادہ اور قناعت پسند تھیں۔ضیاالحق کا دور، ان کی زندگی کا مشکل ترین دور تھا۔مارشل لا کے خلاف تھیں،ایک کچا آم توڑنے کی وجہ سے ان کے خلاف انکوائری قائم کر دی گئی تھی۔ ذوالفقارعلی بھٹوکی پھانسی پر انھوں نے ایک خوب صورت نظم بھی کہی جو بہت مقبول ہوئی۔

نسرین انجم بھٹی جدید پنجابی شاعری کی انتہائی اہم اور بڑی شخصیت ہیں۔ان کا اردو کلام بھی ادبی اعتبار سے اول درجے کا ہے۔حقیقی معنوں میں ایک منفرد لب ولہجہ ان کی شاعری کی ایک بڑی خاصیت ہے۔ان کی شاعری میں ان کے باطن کی آواز ہے جسے بہت کم شاعر دریافت کر پاتے ہیں۔اپنی شاعری سے وہ اپنے معاشرے کے پس ماندہ طبقوں اور خواتین کے حقوق کے لیے آواز اٹھاتی دکھائی دیتی ہیں۔ان کا اسلوب تخلیقی اور سوچ ترقی پسند اور لبرل تھی۔انھیں ان کی خدمات کے لیے جمہوریت ایوارڈ، استادعشق لہر ایوارڈ، پنجابی خواتین ایوارڈ، پوئٹری ایوارڈ اور تمغہ امتیار جیسے اعزازات سے نوازا گیا۔

نثری نظم کی شاعرہ

نسرین آزاد نظم کی ماہر تھیں مگر ان کی مقبولیت کی بنیادی وجہ ان کی نثری نظمیں ہیں۔ان کے عہد میں نثری نظمیں مغرب سے درآمد کردہ صنف سخن سمجھی جاتی تھیں۔اکثر لوگ ان کے مخالف تھے۔نسرین کے بہ قول یہ لوگ اصل میں شاعری کی ہندی اور بین الاقوامی روایات سے ناواقف تھے۔یہی صنف سخن ان کی فکری پرواز کو سمیٹ سکتی تھی اور یہی ان کی پہچان بنی۔ان کا کہنا تھا کہ نثری نظم کسی قسم کے سانچوں میں جکڑتی نہیں بلکہ آغاز سے لے کر اختتام تک ان کا ساتھ نبھاتی ہے۔شاعری اچھی یا بری اپنے مواد کی وجہ سے ہوتی ہے۔انھوں نے نثری نظم کو بوسکی کے تھان سے تشبیہ دی ہے جسے جتنا کھولو، کھلتا جاتا ہے۔البتہ انھوں نے شعوری طور پر کبھی نثری نظم کو ترجیح نہیں دی بلکہ مضمون کے مطابق ساخت کا انتخاب کرتی تھیں۔

موضوعات

نسرین انجم بھٹی کا دور روایتی تصورات سے نئے اسلوب وخیالات نکالنے کا دور تھا۔ان کی تخلیقی شاعری

اورموضوعات اسی انداز کی مثل ہیں۔ ان کے موضوعات منفرد، جرأت مندانہ اور مزاحمتی تھے۔انھوں نے کم زور طبقوں کے حقوق ،نسوانیت اور عورتوں کے استحصال کے خلاف جدوجہد جیسے موضوعات پر کھل کر اظہار رائے کیا اور ان کی شاعری کو نہ صرف غریب بلکہ پڑھے لکھے طبقے میں بھی پذیرائی ملی۔ ان کی شاعری میں سماج کو تبدیل کرنے کی آرزو نظر آتی ہے اور رومانوی احساس بھی موجود ہے۔ نیل کرائیاں نیلکاں ان کا پہلا پنجابی مجموعہ تھا جس کی ساری شاعری مزاحمتی ہے اور عوامی جذبات کا اظہار ہے۔ یہ آمریت کے شکنجے میں پھنسے ہوئے لوگوں کی آواز ہے۔ایک ایسا سفر نامہ ہے جو قاری کو پرامید وادیوں سے اندھیری اور خوف ناک سرنگوں تک لے جاتا ہے۔اس کتاب کی پہلی نظم ''مادھو لعل حسین کی بھینٹ'' اور چند دوسری نظموں میں وہ اپنی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بچنے کی کوشش میں نظر آتی ہیں۔ پھر بہادری سے مرزا کا لبادہ اوڑھ کر مظلوموں پر ہونے والے ظلم وستم کو آواز دینے کا بیڑا خود اٹھا لیتی ہیں۔انھوں نے اس مجموعے میں ریاستی دہشت گردی کے خلاف پرزور احتجاج دائر کیا اور مظلوموں کی کہانیوں کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔

اساں یاراں کولوں پچھیا
ایہہ ٹٹے ہوئے کھڈونے کتھوں لے جے
اوہناں ہس کے اپنے ٹٹے ہوئے دند وکھا دتے

اسیں کون؟ وے اسیں چھان بوریوں لُون
لُون پہاڑاں دا رتا
وچ اتھرو جے ہسن تے اکھاں وچ لُون چج پوے لوں لوں انھا ہووے

ان کی اردو شاعری کی پہلی کتاب ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔جس کا نام بن باس تھا۔ بن باس ایک استعارہ ہے جس سے مراد جنگل کی خوشبو خود میں سمونا ہو سکتا ہے۔خود نسرین کے مطابق بن باس کے موضوع سے مراد بیابان بھی ہے۔ان کا یقین ہے کہ انسان کو ہر چیز مل تو سکتی ہے لیکن اس کے لیے جدوجہد کرنا ہی حاصل ہے۔اس کتاب کو انھوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصے کا موضوع اور عنوان مختلف ہے۔ یہ عنوانات دراصل فلاسفی گیتوں سے لیے

گئے ہیں۔اس کتاب کے پہلے حصے کا عنوان ''مائی ری آنکھیں گھونگھٹ کے اندر'' اوراس کا موضوع عورت کے دکھ درد ہیں کہ عورت گھونگھٹ میں جل رہی تھی اوراسکے پاوں جوگھونگھٹ کے باہر تھے وہ بھی جل رہے تھے۔دوسرے حصے کا عنوان '' آئی ری موری بانوری کرلی'' کتاب کے اس حصے میں رومانوی احساس اوران کے اندر کی رومانوی شاعرہ نظر آتی ہے۔تیسرے حصے کا عنوان '' آنگن بیچ کھڑی بدراد یکھ ڈری'' ہے۔اس سے مراد یہ کہ باہر جاؤں تو بھیگنے کا ڈر ہے اور نہ جاؤں تو محبوب نہیں ملتا۔اس حصے میں زندگی کے منظر کی عکاسی ہے۔جس میں معاشرے اوراس کی مشکلات کا سامنا کرنے کی تیاری کی جاتی ہے۔نیل کرائیاں نیلکاں کے برعکس اس کتاب کا موضوع عورت ہے۔نسرین انجم بھٹی اس میں مردوں کے اس معاشرے میں کھڑی اکیلی عورت پر ہونے والی سختیوں کا ذکر کرتی ہیں۔ ان کی کتاب بن باس کے کچھ مصرعے دیکھیے:

ہم کتنے خود غرض ہیں
اک دوسرے کے سامنے اس لیے نہیں روتے کہ یوں
اک دوسرے کے آنسوؤں سے
ایک دوسرے کی
پیاس بجھے گی۔

ان کے دوسرے پنجابی مجموعے اٹھے پہر تراہ میں بھی کچھ حد تک انھی باتوں کا تسلسل ہے جوانھوں نے نیل کرائیاں نیلکاں میں کی ہے۔اس کتاب کے موضوعات بھی عوامی ہیں۔لیکن ان کا انداز مزاحمتی سے عاجزی میں،غصہ درد میں،جارحیت مایوسی میں بدل جاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ مفاہمت کی طرف بڑھنے لگتی ہیں۔ان کے خواب ڈر کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔کمیونزم کی شکست اور بنیاد پرستی کی جیت سے افسردہ اور ہاری ہوئی آواز ان کی اس کتاب میں موجود لمحوں میں سنائی دیتی ہے۔ان کی کتاب اٹھے پہر تراہ سے چند اشعار:

من کردا اے چیتر ساون پھاگنے اک کھیڈ رچائیے
بھوراں دے نال بھور جائیے ،رکھاں دے نال رکھ
نت نت چھانگے وڈھے جائیے

مڑ ہر پا یئے

سک سر پر مرجھائے نا ہیں۔

ان کے تیسرے پنجابی مجموعے کا نام شاملاٹ ہے اور یہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔نسرین صوفیانہ مزاج کی مالک تھیں اور اپنی شاعری پرچیوں پر لکھتی تھیں۔اسی وجہ سے یہ مجموعہ کتاب کی شکل میں موجود نہیں تھا۔اور ایک غیر مطبوعہ کاغذات کے پلندے سے نظمیں اکٹھی کر کے ترتیب دیا گیا کیوں کہ اس کتاب کی تشکیل نسرین انجم بھٹی نے خود نہیں کی اس لیے اس کا معیار نیل کرائیاں نیلکاں اور اٹھے پہر تراہ جیسا نہیں۔شاملاٹ میں دکھ دردوں، سماج کی بدرنگیوں اور ناانصافیوں کا بیان اس انداز میں کیا گیا ہے:

میں سنیا اے دکھاں نوں گلاں کر دیاں

میں سنیا اے

آدمی دے اندر ہک ہور آدمی وی ہوندا اے

جیہڑا اوہنوں جیون نہیں دیندا

کہ ایہہ دو آدمی کٹھے جمدے نے

جاں آدمی دے وچوں آدمی پنگر پیندا اے

نسرین ،بھٹو اور پیپلز پارٹی کی جیالی تھیں ان کی موت پر انھوں نے بڑے اشک بہائے اور نظمیں لکھیں۔ان میں سے کچھ شائع ہوئیں اور کچھ کو یہ اعزاز نہ ملا۔ان میں سے ایک نظم ’’شہید ذوالفقار علی بھٹو دی وار‘‘ کے دو شعر یہ ہیں:

میں مرزا ساگر سندھ دا میری راول جنج چڑھی

میں ٹریا سولی چم کے مینوں ایہو ریت بڑی

میں پیواں بھر بھر چلیاں زہر تریہاں لڑی

چولے لتھے انصاف دے خلقت حیران کھڑی

نسرین کے سارے کلام میں زمانے کی داستان اور بول ہیں۔ یہ مزاحمت اور بغاوت کی ایک خوب صورت

داستان ہے۔جس میں وہ ظلم اور جبر کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں۔ان کی شاعری انسانی عظمت کا ایک اعلامیہ بھی ہے اور عورت کے حقوق کی آواز بھی ہے۔ یہ احترامِ آدمیت کا ایک پیغام بھی ہے اور شاہ حسین کی ''ویل'' بھی۔

فن اور ادبی خصوصیات

نسرین انجم بھٹی نہایت منفرد لب و لہجے اور اسلوب کی شاعرہ تھیں۔ ان کی اردو اور پنجابی شاعری نے اس صنف کو بہت کچھ دیا انھوں نے اردو شاعری میں تشبیہات اور استعارے استعمال کیے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں تلمیحات کا استعمال بھی بہت خوب صورت انداز میں کیا۔اس کی ایک مثال یہ ہے کے ان کی شاعری میں ڈھول والوں کا ذکر بھی آتا ہے۔اس پر ایک بار انھوں نے بتایا کے ڈھولچی اصل میں باغی ہوتے ہیں وہ ماحول میں ہلچل مچا دیتے ہیں۔مگر بلا وجہ نہیں، کبھی کوئی خاص پیغام لاتے ہیں اور کبھی کوئی خبر۔ چناں چہ ڈھولچی بغاوت کا استعارہ ہے۔نسرین کے بارے میں عبداللہ حسین کہتے ہیں، ''اب اتنے سالوں کے بعد نسرین کی نئی شاعری کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے اس عرصے کے اندر صرف سیاق اور محاورے کی تشکیل میں بلکہ الفاظ اور جذبات کے باہم میل جول کی وضع کاری میں کس قدر ترقی کی ہے۔''

نسرین کے اسلوب میں تنوع کا عنصر بھی موجود ہے جس کے باعث پڑھنے والے نسرین سے ہم آواز ہوتے ہیں وہ اپنی نظموں کے لیے کسی قسم کا شعوری اہتمام نہیں کرتیں بلکہ ان کا مزاج اور عوامی انداز خود بہ خود ان کی شاعری میں خوب صورتی اور خصوصیات پیدا کر دیتا ہے۔نسرین کے ہاں بروکن امیجز کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ان کا سارا دھیان اپنی نظم کے موضوع اور بنیادی بات پر ہوتا تھا۔ان کی کچھ مختصر نظمیں ملاحظہ کیجیے:

میں نے اپنی سولی اپنے کندھے پر نہیں اٹھائی اپنے سینے سے لگائی ہے
میں نے کوئی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جرم تو نہیں کیا نا!۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(نہج)

لکڑی کا گل دان بہت سندر تھا لیکن
گر کر ٹوٹ نہیں سکتا تھا

(ننھی نظم)

ہوا میرے چاروں طرف ناچتی ہے
میں کرہ ارض پر آخری نفس ہوں
اور شاید سچی ہوں
ایمان اور پچھتاوے کی طرح

(سکھشا)

''سوال کی موت''، ''محبت کی پہلی نظم''، ''آٹھواں دروازہ''، ''بن باس''، ''ایک سازش جو میرے اندر پکڑی گئی'' ان کی چند مشہور طویل نظمیں ہیں۔

نسرین، شاہ حسین لاہوری کو پسند کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا انداز نسرین کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔ ان کی شاعری کے ہر لفظ میں شاہ حسین کی طرح دھیمے سے سلگتا ہوا دکھ ہے۔ بڑے سے بڑے دکھ کو انتہائی سادگی سے پیش کرنا اور صبر وسکون کا دامن نہ چھوڑنا بھی شاہ حسین کی ہی دی گئی تعلیم ہے۔ کہیں کہیں ان کا ایک مصرعہ اتنا معنی خیز ہوتا تھا اسے اپنے آپ میں ایک پوری نظم کہا جا سکے۔ مثلاً:

''تبے چھڑ میں ہوکا دیواں اپنے اپنے ساہ ڈک لونجھواں دا ہڑھ آ ئیا جے''

نسرین نے اپنی شاعری کے ذریعے نثری نظم کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی نظموں اور موضوعات میں عصری شعور موجود ہے۔

میں نے انھیں بہت بار دھویا
یہ بہت بار میلے ہو گئے
میں نے انھیں بہت بار سکھایا
یہ بہت بار گیلے ہو گیے
میں نے انھیں بہت بار بچایا
یہ بہت بار زخمی ہو گئے

(میرے دوست)

نسرین کی شاعری پرانے وقتوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔اس میں خانہ بدوش لوگوں کے گیتوں جیسی پراسرایت ہے جو پڑھنے والے کو کسی اور زمانے میں لے جاتی ہے وہاں سب کچھ دھندلا جاتا ہے۔فاصلوں اور حقیقتوں کا کوئی معنی نہیں رہتا۔قاری پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے مثلاً:

''وے کہیڑا ایں میریاں آندراں نال منجی اُندا''

جہاں ایک طرف انھیں افتخار عارف نے پنجابی کی سب سے بڑی شاعرہ قرار دیا وہیں اردو میں ان کی شاعری لاجواب گنی جاتی ہے۔

محمد احمر

اردو شاعری اور شعریات

محمد اظہار الحق، موضوعات اور ادبی خصوصیات

۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو پنجاب کے گاؤں جھنڈیال، ضلع اٹک، پنجاب میں پیدا ہونے والے محمد اظہار الحق اردو زبان کے مشہور شاعر، کالم نگار، تجزیہ نگار اور دانش ور ہیں۔ گریجویشن میں گورڈن کالج راولپنڈی میں ٹاپ کیا اور رول آف آنر جیتا۔ انھوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم اے اکنامکس کیا۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا اور ازبک زبان بھی سیکھی۔ ۱۹۷۲ء میں سول سروس میں شمولیت اختیار کی۔ انھوں نے ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل آف پاکستان کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ بعد میں ایڈیشنل سیکرٹری ملٹری فنانس کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ۲۰۰۸ء میں ایڈیشنل آڈیٹر جنرل آف پاکستان کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اردو ادب اور صحافت میں گراں قدر خدمات پر ۲۰۰۸ء میں پاکستان کے اعلیٰ سول ایوارڈ تمغۂ حسن کارکردگی سمیت مختلف ادبی اور قومی ایوارڈز سے نوازا گیا ہے۔ آج کل اظہار الحق روزنامہ ''دنیا'' سے منسلک ہیں جس کے لیے وہ ''تلخ نوائی'' کے نام سے کالم لکھتے ہیں۔

محمد اظہار الحق کی اردو شاعری کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ دیوارِ آب ان کی پہلی کتاب ہے جس کی بے حد مقبولیت کی وجہ سے وہ ''آدم جی ادبی ایوارڈ'' کے حق دار ٹھہرے۔ اس کے بعد اردو شاعری میں ان کی دو کتابیں غدر اور پری زاد بالترتیب ۱۹۸۶ء اور ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئیں۔ ان کی چوتھی کتاب پانی پہ بچھا تخت کو ۲۰۰۳ء میں ایک اور اعزاز، ''ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ ان کا کلیات کئی موسم گزر گئے مجھ پر ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ ان کی شاعری کا انگریزی ترجمہ یاسمین حمید نے کیا اور وہ آکسفورڈ یونیورسٹی

پریس نے ۲۰۱۰ء میں شائع کیا۔

محمد اظہار الحق ایک نڈر اور دلیر شخصیت کے مالک ہیں۔ حالات نے ان کے اندر سختی تو پیدا کی مگر ان کے اندر موجود ایک عاجز اور خوفِ خدا رکھنے والے شخص کو نہ بدل سکے۔ انھوں نے مذہبی شاعری کو مستقل موضوع تو نہ بنایا مگر وقتاً فوقتاً اس پر لکھتے رہے۔ ان کے کلام میں ان کا اپنے خالقِ حقیقی سے ایک نہایت ہی قریبی تعلق معلوم ہوتا ہے۔ زندگی میں ملنے والی ہر کامیابی پر وہ خدا کے شکر گزار نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے تعلق قابلِ دید ہے۔ ان کی ایک مشہور نعت کے اشعار دیکھیے:

علم جتنے ہیں، ترے اسم کی برکت سے ہیں
حُسن جتنے ہیں ترے جسم کی برکت سے ہیں
چاند کیا ہے؟ تری انگلی کے اشارے کا غلام
اور سورج ماتھے کے ستارے کا غلام

حمدِ باری تعالیٰ اور نعتوں کے علاوہ انھوں نے اپنے والد، والدہ، بھائیوں اور خاندان کے دیگر افراد کے انتقال پر مرثیے بھی کہے۔ والدہ کی یاد میں لکھا گیا مرثیہ کافی مشہور ہوا جس کے نیچے دیے گئے دو اشعار دیکھیے:

سرِ شام گھر سے فرشتہ سر سے ہما گیا
سرِ شام وعدہ تھا جس پرندے کا آ گیا
سرِ شام کیسا طلسم اسم سے کٹ گیا
سرِ شام درد کا رشتہ جسم سے کٹ گیا

اس کے علاوہ اسلام اور مسلم دنیا کے عروج پر بھی ان کی بے شمار تحریریں موجود ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں عدم برداشت عروج پر ہو، وہاں اظہار الحق کی اپنے شان دار ماضی میں زندہ رہنے والے مسلمانوں کو آئینہ دکھانے کی کوشش بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے کھوئے مقام کی تلاش اور اس کے ملنے کی آرزو کو بھی جدید انداز میں بیان کیا ہے۔ اظہار الحق کی ''قرطبہ میں'' کے عنوان سے ایک نظم کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کریں، جن میں انھوں نے اندلس میں مسلم حکمرانی کے سنہری ایام کی یاد دلاتے ہوئے کہا ہے:

بدن پہ کوئی زرہ ہے نہ ہاتھ میں تلوار
اور اشک زار میں صدیوں کے اندلس کا سفر
اس آسمان کے نیچے کہیں پڑاؤ نہ تھا
عجیب طلسم تھا وہ آٹھ سو برس کا

ملکی زبوں حالی اور اشرافیہ کی لا پروائی بھی اظہار الحق کے قلم کا نشانہ بنے۔ان کے اندر یورپی ملکوں کے خلاف روایتی تعصب نہیں ملتا۔ ان مغربی معاشروں کو نصیحت کرنے کی بجائے انھوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہم ان سے کیا سیکھ سکتے ہیں۔ان کے قلم نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں برتی۔سب سے بڑھ کر اپنے سے طاقت ور کے خلاف بولنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔جب حکمرانوں کے بڑھتے ہوئے مظالم دیکھے تو انھیں نتائج سے خبر دار کیا:

یہ ریشم یہ لباسِ حکمرانی جل اُٹھے گا
وہ ظلمت ہے کہ آخرکار پانی جل اُٹھے گا
یہاں فرقِ مراتب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
مگر یہ بھی تو اے دنیائے فانی جل اُٹھے گا
کنیزیں سازشیں شمعیں ستارے رات کے رات
سحر ہو گی تو خیمہ آسمانی جل اُٹھے گا

اظہار کا شمار ان افراد میں ہوتا ہے جنھیں معاشرتی ناہمواریاں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ایک طویل عرصے تک اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے جہاں سے ان چیزوں کا مشاہدہ کیا جو عام آدمی کی نظر سے اوجھل رہتی ہیں۔انھی واقعات نے اظہار الحق کو سماج اور زمانے کی تباہ حالی پر بھی قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔نیچے دیے گئے اشعار اسی محروم طبقے کی آوز بنتے ہوئے لکھے گئے ہیں۔ملاحظہ کریں:

تنا یا قوت کا، شاخیں زمرد کی بنی تھیں
ثمر لعل و گہر تھے، نخل کا سایہ نہیں تھا
پروں میں آئنے، منقار میں تاج شہی تھا
پرندہ قاف سے آیا مگر اُڑتا نہیں تھا

دکھ بھرے معاشرتی پہلوؤں نے شاعر کی سوچ کو بھی متاثر کیا۔ ان کی سوچ انسان کے تخلیقی عمل اور اس کے گرد موجود نامعلوم سچ کے گرد گھومتی ہے۔ اظہار اپنی شاعری میں بعض مقامات پر اپنے وجود کی وجوہات تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کا جائزہ اس امر کی نشان دہی بھی کرتا ہے کہ جب انسان اس جستجو کی ایک منزل پار کرتا ہے تو اس پر مزید حقائق کھلتے ہیں۔ اظہار الحق کی شاعری کا فلسفہ وہ مادہ فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے ہم زندہ رہتے اور خود کو برقرار رکھتے ہیں۔ اظہار کی مشہور نظم ''یہی مٹی سونا چاندی'' کے اشعار ملاحظہ ہوں:

اس مٹی سے ہم پھوٹیں گے کونپل بن کر
یہی مٹی ماں ہمیں جنتی ہے جیسی بھی ہے
اسی مٹی میں اجداد کی مٹی شامل ہیں
یہی خون رگوں میں بنتی ہے جیسی بھی ہے

اظہار الحق کے کلام میں ناکام عاشق کے جذبات اور احساسات بھی نمایاں ہیں۔ اظہار نے عشقیہ شاعری پر لکھتے ہوئے اردو ادب کے روایتی انداز کو اپنایا ہے۔ ان کی شاعری میں محبوب کی بے وفائی کا عنصر واضح ہے۔ محبوب کی بے وفائی کے بعد کی اپنی حالت زار بھی انھوں تفصیلاً لکھی ہے۔ لیکن محبوب کے لوٹنے کی آس ان کی شاعری کا منفرد پہلو ہے۔ اپنی شاعری میں جگہ جگہ پر ناسٹیلجیا کا شکار رہنے والے اظہار الحق اپنی شاعری میں محبوب کے ساتھ بیتے ہوئے لمحات کو یاد کرتے نظر آتے ہیں۔ جس میں سماجی رویوں سے اکتاہٹ بھی جھلکتی ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

اکیلا ہوں میں اور کہیں دور وہ اوڑھنی اُڑ رہی ہے
بس آنکھوں میں دھول اور سارے میں ایک چاندنی اُڑ رہی ہے
اندھیرے کی لہروں پہ میں ہوں، میری کشتیاں آ رہی ہیں
کنارے پہ تُو چل رہی ہے، تری روشنی اُڑ رہی ہے
کہیں روح میں کھل رہا ہے دبا گوشۂ چشم ترا
کہیں برف پہنے پہاڑوں پر تری ہنسی اُڑ رہی ہے

اظہار الحق نے اپنی شاعری کے لئے کئی دل چسپ موضوعات کا بھی انتخاب کیا ہے۔ انن کی تخلیقات میں

نئے خیالات ملتے ہیں۔ایک نئی دنیا ملتی ہے، جہاں ماضی، حال اور مستقبل گلے ملتے ہیں۔کوئی بھی ان کے قلم کی کاٹ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ان کی شاعری میں درد، انسان دوستی اور سب سے بڑھ کر صدیوں پرانی روایات کا حیا ہے۔اپنی دھرتی، اپنی مٹی، ماں بولی، بھولی بسری روایتوں اور لوک کہانیوں کو اظہار نے بہت پیار سے بیان کیا ہے۔ ان کی کتاب پانی پہ بچھا تخت کی نظم ''کیا تم نے کبھی؟'' کے درج ذیل اشعار دیکھیے:

کیا تم نے کبھی
بیری کی خشک ٹہنیوں سے
جو بکریوں کے لیے کاٹ لائی جاتی ہیں
سوکھے ہوئے بیر چُن چُن کر کھائے ہیں؟
کیا تم نے چارہ کترنے والا ٹوکا دیکھا ہے؟
جس کے ہر وار پر اس کا دل باہر آجاتا ہے

اپنی شاعری کے علاوہ اظہار الحق نے بے باک کالم نگاری سے بھی خوب شہرت حاصل کی۔کچھ برس پہلے ایک تقریب میں اظہار الحق نے کہا ''شاعری ہمیشہ ہی میری اولین ترجیح رہی ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ موجودہ پاکستانی معاشرے کو محض شاعری کے ذریعے تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔اس لیے میں اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ مضامین لکھنے پر بھی توجہ مرکوز رکھتا ہوں''۔جس وقت اظہار الحق کی مدت ملازمت مکمل ہوئی پاکستان کے حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔اس لیے ان کے کالم زیادہ تر موجودہ ملکی حالات کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ اپنے کالموں میں بلا جھجک حکومت کی عوام دشمن پالیسیوں کو نشانہ بناتے ہیں۔اس کے علاوہ عوام کو درپیش مسائل بھی حکومتی ایوانوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔موجودہ دور میں شروع ہونے والی مذہبی دہشت گردی اور فرقہ واریت بھی ان کی نظر سے اوجھل نہ رہ سکی۔گرتی ہوئی انسانی اخلاقیات اور موجودہ دور میں بڑھتے ہوئے بے حسی کے واقعات پر بھی خوب لکھا اور معاشرے کی اصلاح کی کوشش کرتے رہے۔

اظہار الحق کی فکر کے کئی پہلو اردو ادب کے روایتی موضوعات پر مبنی ہیں۔لیکن انھیں بیان کرنے کا انداز اور

ان کی شاعری میں موجودان کی شخصیت کے کئی مختلف روپ کالموں میں موجود کڑوا سچ انھیں ہم عصر شعرا اورادیبوں میں ممتاز بناتا ہے۔

اظہار کا انداز واضح طور پر جدت پسندانہ ہے اور جدید اردو غزل میں انہیں رجحان ساز سمجھا جاتا ہے۔ان کا طنز یہ اور استعاراتی اظہار قارئین کی امنگوں کو مسخر کرتا ہے۔وہ اپنی آزاد اور نثری نظموں کو غزل کی سی آسانی سے تخلیق کرتے ہیں۔اظہار الحق نے زبان اور تکنیکی سطح پر نئے تجربات کیے۔اس کے علاوہ وہ ادبی حلقوں میں ایک منفرد اور نظریاتی مؤقف رکھنے والے شخص کے طور پر جانے جاتے ہیں۔انھوں نے شاعری کی تمام اصناف پر لکھا۔ان کا بیشتر کام نظموں خصوصاً آزاد نظم پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ غزل کی صنف پر بھی ان کا کام قابلِ دید ہے۔ان کی شاعری کے فن کی توثیق کرتے ہوئے، پاکستان کے مایہ ناز افسانہ نگار انتظار حسین نے تبصرہ کیا: ''اظہار الحق غزل کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی اتنی ہی جان کاری رکھتے ہیں۔دونوں ہی اصناف میں وہ ایسا تخیل تیار کرنے میں کامیاب رہے ہیں، جواس کے کلام کو ہم عصر شعراء میں منفرد بناتا ہے۔'' مشہور اردو شاعرہ یاسمین حمید نے اظہار الحق کو اردو ادب میں نئے رجحانات متعارف کروانے والا شاعر قرار دیا۔

اظہار الحق نے جن فنی محاسن کا استعمال کیا ہے ان میں استعارات اور تشبیہات سرفہرست ہیں۔مندرجہ ذیل شعر میں مٹی، جس سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے، کے لئے ''سونا چاندی'' کا استعارہ ملاحظہ ہو:

یہی مٹی سونا چاندی ہے، جیسی بھی ہے
یہی مٹی اپنی مٹی ہے، جیسی بھی ہے

استعارات کے لیے مزید دو اشعار دیکھیے:

سرِ شام کیسا نظارہ تھا مرے باغ میں
ترے ساتھ ایک ستارہ تھا مرے باغ میں
مجھے کیا خبر تھی کہ اصل میں وہ فرشتہ تھا
جو مسافر اک تھکا ہارا تھا مرے باغ میں

اوپر دیے گئے اشعار میں اظہار نے اپنے لیے تھکے ہارے مسافر، ستارے اور فرشتے کے استعارات کا استعمال کیا ہے۔

استعارات کے ساتھ ساتھ تشبیہات بھی اظہار کی شاعری کا لازمی جزو سمجھی جاتی ہیں۔درج ذیل شعر میں انسان کے دفن ہونے کے عمل کو بیج کو زمین میں بونے کے عمل سے تشبیہ دی گئی ہے:

اسی مٹی میں ہم بیج کی صورت جائیں گے
ہمیں اپنے اندر رکھتی ہے جیسی بھی ہے

اظہار الحق نے شاعری میں تلمیحات کا بھی خوب استعمال کیا ہے۔ان تلمیحات میں زیادہ تر اسلامی واقعات اور مسلم حکمرانی کے ادوار کے حوالے موجود ہیں۔مثال کے طور پر ان کی مشہور نظم ''قرطبہ میں'' میں اندلس میں مسلمانوں کی حکمرانی کے حوالے موجود ہیں۔تلمیحات کے علاوہ تراکیب کا استعمال بھی اظہار کے ہاں عام ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں ''آبِ شیریں'' کی ترکیب دیکھیں:

یہ پیاس سے جاں بلب ہیں منکر مرے ہنر کے
میں سنگِ خارا سے آبِ شیریں نکالتا ہوں

ترکیب کے ضمن میں ایک اور شعر دیکھیے:

کئی موسم مجھ پر گزر گئے احرام کے ان دو کپڑوں میں
کبھی پتھر چوم نہیں سکتا کبھی اذانِ طواف نہیں ہوتا

اس شعر میں ''اذانِ طواف'' کی ترکیب کا استعمال کر کے جو کیفیت بیان کی گئی ہے، وہ بھی منفرد ہے۔

اظہار کو جذبات اور احساسات کا شاعر کہا جاتا ہے خواہ وہ ناکام عاشق کے ہوں یا حالات کے مظالم سے نڈھال عوام کے یا اظہار کی ذاتی زندگی کے۔اظہار الحق نے مختلف احساسات اور کیفیات کے لیے علامتوں کا استعمال کر کے اپنی شاعری میں جان پیدا کی ہے۔مرثیہ ''سرِ شام ریت نے'' کا شعر دیکھیے، جس میں آئینے کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے:

سرِشام مجھ سے لپٹ کے آئینہ رو دیا
سرِشام عکس نے اپنے اصل کو کھو دیا

اظہار کی شاعری میں حسنِ تعلیل کی مثالیں بھی ملتی ہیں جو کہ نیچے دیے گئے اشعار میں واضح ہیں۔ایک شعر

ملاحظہ کیجیے:

فرشتوں نے جھاڑے تھے پَر اس فضا میں کئی سال پہلے
سروں پر مگر ایک شے اب بھی خاکستری اُڑ رہی ہے

اس شعر میں فضا میں خاک اڑنے کی وجہ فرشتوں کے پَر جھاڑنے کو کہا گیا ہے جو اُس کی اصل وجہ نہیں ہے۔ حسنِ تعلیل کی نیچے ایک اور مثال دی گئی ہے:

سرِشام سارے دیے لہو میں بھڑک اٹھے
سرِشام شعلے رگِ گلو میں بھڑک اٹھے

اوپر دیے گئے شعر میں دیے کے بھڑک اٹھنے کی وجہ لہو کا بہنا بتایا گیا ہے جو کہ ممکن نہیں۔

مبالغہ آرائی ایک اور اہم فنی حسن ہے جس کے ذریعے اظہار نے عوام کی توجہ حاصل کی۔ مبالغے کا مظاہرہ درج ذیل شعر میں دیکھیں:

میں اپنی توقیر عشق میں بھولتا کہاں ہوں
میں چاند کے سامنے ستارہ اجالتا ہوں

ایک انسان کا ستارہ اجالنا، وہ بھی چاند کے سامنے، قابلِ فہم نہیں ہے۔

اظہار کی شاعری میں موجود صنعتِ تضاد کی خوبی کی ایک مثال درج ذیل ہے جس میں ایک ہی مصرعے میں ''شب اور روشنی'' اور ''سفید اور سیاہ'' جیسے متضاد الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے:

یہ عکس ہے جو نظر آرہا ہے، اصل نہیں
کے شب سفید ہے اور روشنی سیاہ مری

اوپر دی گئی مختلف مثالوں سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اظہار الحق نے شاعری میں فنی محاسن کا بھرپور استعمال کیا ہے۔

اظہار الحق کا شعری کلام اور کالم زیادہ تر اشرافیہ اور پڑھے لکھے طبقے کو ہدف بناتے ہیں۔ اظہار کی شاعری چوں کہ ایک ایسے طبقے کو مخاطب کرتی ہے جو ادبی سمجھ بوجھ رکھتا ہے اس لیے اس میں استعمال کردہ الفاظ پیچیدہ ہیں۔ انھوں نے مختلف جگہوں پر ابہام کا استعمال کیا ہے اور چھپا ہوا مطلب مکمل سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص ہی نکال سکتا ہے۔

اس کے علاوہ چوں کہ حکمران اور ظالم طبقے کو للکارنے کا موضوع اظہار کے ہاں غالب ہے۔اس لیے ان کی شاعری اور کالموں میں سخت الفاظ کی بھرمار نظر آتی ہے جو حالات کی سنگینی کا پتہ دیتے ہیں۔ایک شعر دیکھیے:

کروں گا میں حساب اے حُسن! تیری حدتوں کا
مگر اس روز جب برگِ جوانی جل اٹھے گا

اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اظہار الحق نے اپنا پیغام سامعین تک احسن طریقے سے پہنچایا ہے۔نظموں کے برعکس اظہار کی زیادہ تر غزلیں ہلکی اور دھیمے آہنگ میں لکھی گئی ہیں۔اس لیے ان میں گیت جیسی نرمی اور ترنم کی کیفیت یقینی تھی۔جس کے باعث ان کے کلام کو بہ آسانی گایا جا سکتا ہے۔اظہار الحق نے تمام ادبی اصولوں اور روایات کو ملحوظِ خاطر رکھ کر شاعری کی۔ان کی شاعری ان اسالیب سے پاک ہے جو تکرار زدہ فارسی لفظیات وتراکیب اور استعاروں پر استوار ہیں۔ ان کے کلام میں حقیقت پسندی، سادگی، عوامی نقطہ نظر اور انسانی کیفیات سرِ فہرست نظر آتی ہیں۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ محمد اظہار الحق عمر بھر مختلف سرکاری عہدوں پر رہے جہاں سے ملنے والے تجربات نے ان کی شاعری کے لیے خام مواد کا کام کیا۔ اظہار الحق کبھی اپنے بچپن کے خیالوں میں کھوئے نظر آتے ہیں تو کبھی انھیں معاشرتی زبوں حالی ستاتی ہے۔کبھی وہ محبوب کی بے وفائی سے نڈھال نظر آتے ہیں تو کبھی حاکم وقت کو للکارتے ہوئے۔آپ کی زندگی کے تجربات آپ کی شاعری میں رنگ بھرتے نظر آتے ہیں۔آپ کی شاعری میں جدیدیت کا عنصر نمایاں ہے۔اظہار الحق کا اسلوب اچھوتا اور باقی شاعروں سے مختلف ہے۔اپنے اشعار کی خوب صورتی بڑھانے کے لیے اظہار نے فنی محاسن کا سہارا لیا۔ آپ کی شاعری پیچیدہ الفاظ پر مشتمل ہے لیکن نظموں کے برعکس غزلیں گائکی کی ضروریات پوری کرتی ہیں۔مختصر یہ کہ محمد اظہار الحق نے اردو ادب کے لیے بے شمار خدمات سرانجام دی ہیں۔

محمد علی وسان

اردو شاعری اور شعریات

ادریس بابر کی شاعری کا فنی و فکری تجزیہ

ادریس بابر کا نام سنتے ہی جدید اور مابعد جدید شاعری کا ایک خاکہ ابھر کر سامنے آتا ہے جو عجیب ہونے کے ساتھ ساتھ حیران کن حد تک تازہ ہے۔ ادریس بابر نے اپنے منفرد لب و لہجے کی وجہ سے ایسی شہرت حاصل کی ہے کہ کئی اہم نقاد بھی ان کی قابلیت کے معترف ہیں۔ ادریس بابر کے ایک ہم عصر شاعر جواد شیخ ان کے بارے میں کہتے ہیں ''ادریس بابر میری نظر میں ایک غیر معمولی ذہین انسان کا مقام رکھتا ہے۔ اس کی ساٹھ فی صد شاعری اوٹ پٹانگ ہوگی مگر باقی چالیس فیصد شاعری کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ کو تین بار جنم لینا پڑے گا''۔ ادریس بابر کی پیدائش پاکستان کے شہر گوجرانوالہ میں ۱۹۷۳ء میں ایک علمی گھرانے میں ہوئی۔ معروف شاعر جان کشمیری جن کا درج ذیل شعر ادبی حلقوں میں بہت معروف ہے، رشتے میں ان کے چچا ہیں:

پسِ پردہ بھی تکلّم سے گریزاں رہنا
لوگ آواز سے تصویر بنا لیتے ہیں

ادریس بابر کے شعری سفر کی ابتدا ۱۹۹۰ء میں انجینئرنگ یونیورسٹی، لاہور (یو ای ٹی) سے ہوئی جہاں کی لٹریری سوسائٹی کے وہ صدر بھی رہے۔ ان کی شناخت کا سفر ۱۹۹۲ء میں احمد ندیم قاسمی کے رجحان ساز ادبی مجلّے فنون میں ان کی غزلوں کی اشاعت سے شروع ہوا۔ ۲۰۰۰ء تک وہ ادبی منظرنامے پر اپنا ایک الگ مقام قائم کر چکے تھے۔ کچھ عرصہ وہ ناروے میں رہنے کے بعد ۲۰۱۱ء میں پاکستان واپس آئے اور ان کا پہلا شعری مجموعہ یونہی ۲۰۱۲ء میں سامنے آیا۔ اس کے منظرِ عام پر آتے ہی ادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا اور اسے فیض احمد فیض ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس مجموعے میں ان کا ۲۰۰۰ء تک کا کلام ہے۔ اس میں اور ان کے بعد کے کلام کے اسلوب میں بہت فرق

ہے کیوں کہ ان کا شروع کا کلام تازہ تو ہے لیکن وہ ذرا روایت سے جڑا ہوا بھی ہے جب کہ اب وہ روایت سے انحراف کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ ادریس بابر نے حال ہی میں شاعری میں ایک نئی صنف ''عشرہ'' کے نام سے متعارف کروائی ہے۔ چوں کہ ادریس بابر کی شاعری کا ذکر عشرے کے بیان کے بنا مکمل نہیں ہے، سو اس مضمون میں پہلے عشرے کی بات کی جائے گی اور اس کے بعد ادریس بابر کے اسلوب پر ایک نگاہ ڈالی جائے گی۔

ادریس بابر نے ۲۰۱۴ء میں شاعری کی ایک نئی دس سطری صنف کا باضابطہ اعلان کیا جسے انھوں نے عشرے کا نام دیا۔ اردو میں شاعری کی صنف کا نام اس کی سطروں کے مطابق رکھنے کی پرانی روایت ہے جیسے مسدس، مخمس وغیرہ۔ عشرہ عربی کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں ''دس'' اور عشرے میں صرف ایک ہی قید ہے اور وہ دس سطروں کی ہے۔ اس کے علاوہ عشرہ منظوم، مقفیٰ، نثری اور بلینک ورس بھی ہوسکتا ہے۔ ردیف کی حد ہے نہ قافیے کی۔ سطروں کی لمبائی کی بھی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک مصرع فعلن، دوسرا مفاعلاتن تو تیسرا کسی بھی بحر سے آزاد ہوسکتا ہے۔ ادریس بابر غزل کے ایک عمدہ شاعر ہیں۔ عشرے کی بنیاد پر انھیں بہت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ لوگوں نے یہاں تک بھی کہا کہ ایک اچھا شاعر اوٹ پٹانگ حرکتوں میں پڑ گیا ہے۔ ادریس اس ساری تنقید سے بے نیاز عشروں پہ عشرے لکھتا گیا جن کا بنیادی مقصد روایتی پابندیوں سے ہٹ کر عوامی مسائل پر لکھنے میں آسانی پیدا کرنا ہے۔ جب نقادوں نے نوجوانوں میں اس کی مقبولیت دیکھی تو اب اسے آہستہ آہستہ قبولیت کا شرف بخش رہے ہیں۔

اردو شاعری میں ایک عرصے سے واقعات سے بڑی حد تک جان چھڑالی گئی تھی اور واقعاتی شاعری کو کم تر شاعری کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ اقبال کبھی فاطمہ بنت عبداللہ پر نظمیں لکھتے تھے یا حالی مدوجزرِ اسلام پر واقعاتی مسدّس کہتے تھے۔ اس کے بعد سے آزاد نظم چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر اس قدر اوپر اٹھتی چلی گئی کہ دنیا کے حالات و واقعات کہیں دور نیچے رہ گئے۔ ادریس کے اکثر عشروں کے موضوعات واقعاتی ہوتے ہیں اور وہ روزمرّہ واقعات سے تحریک پا کر عشرے لکھتے ہیں۔ ان کے عشروں میں مکالماتی انداز بہت پایا جاتا ہے اور مکالموں کی بے ساختگی سے وہ 'شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات' کے مصداق کوشش کرتے ہیں کہ بات قاری پر گہرے سے گہرا اثر چھوڑے۔ اسی طرح کی کوشش ان کا ایک واقعاتی عشرہ ہے جو انھوں نے کوئٹہ میں ہونے والے

بم دھماکوں کے پس منظر میں لکھا۔

کہاں ہے کوئٹہ، کیا ہے کوئٹہ
بم دھماکا ہوا وہاں؟ نہ کرو!
ہاسٹل کا کرایہ چڑھ گیا ہے
اچھا، پہلے بھی ہوتے ہیں! کس وقت؟
حبس بارش سے اور بڑھ گیا ہے
بیسیوں لوگ مارے گئے؟ لو سنو!
چلتے ہیں تم نے چائے پی کہ نہیں
پہلے بھی مارے جاتے ہیں! اس وقت؟
فلم وہ ڈاﺅن لوڈ کی کہ نہیں
کیا وہاں ڈائیوو کا اڈا ہے
اوہو، تھری جی میں کوئی پھڈا ہے!

اس عشرے میں صرف واقعات کا بیان ہی نہیں ہے بلکہ ان دس سطروں میں ادریس بابر نے بہ حیثیتِ قوم ہماری بے حسی پر طنز کیا ہے۔ اس میں دو لوگوں کے درمیان مکالمہ ہے، ایک بار بار کوئٹہ میں ہوئے بم دھماکے کا ذکر کرتا ہے جب کہ دوسرا بندہ معاشرے کی علامت ہے جسے اس بات سے زیادہ ضروری چیزیں ہاسٹل کا کرایہ، بارش، حبس، فلمیں وغیرہ لگتی ہیں۔ ادریس نے بڑے کمال سے juxtaposition کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ چوں کہ عشرہ کسی قسم کی موضوعاتی جکڑ بندی کا پابند نہیں ہے، اس لیے اس میں زمین اور آسمان کے درمیان کوئی بھی امر زیرِ بحث آ سکتا ہے۔ ادریس کا ایک رومانوی عشرہ نوجوانوں میں بہت مشہور ہے اور ان سے ہر مشاعرے میں وہ سنانے کی فرمائش کی جاتی ہے، درج ذیل ہے:

ادھر گوری کو نیند پل بھر نہ آئی
بدن سے وچھوڑے کی کلکل چھڑائی

وہ سورج کی ٹکیا سے مل مل نہائی
نکھر کر نکل آئی ہلچل مچائی
خدا ہو نہ ہو گنگ ٹھیری خدائی
ادھر ریل گاڑی نے سیٹی بجائی
محبت، جدائی، محبت، جدائی
مسافر اسی دائرے میں رہے گا
وہ یہ جان کر اک سٹیشن پہ اترا
کہ وہ عمر بھر راستے میں رہے گا

صرف نوجوان عشرہ سننے اور پڑھنے میں ہی دل چسپی نہیں لے رہے بلکہ کئی نوجوان شعرا اس صنف میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔عشرے کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ پنجاب کی درس گاہوں میں اب جتنے بھی سخن کے مقابلے ہوتے ہیں ان میں غزل اور نظم کے علاوہ عشرے کے مقابلے بھی منعقد ہوتے ہیں اور طلبہ ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔لمز ادب میلہ ۲۰۱۹ء میں بھی اسی طرح عشرے کا ایک مقابلہ منعقد کیا گیا تھا جس میں یو ای ٹی کی ایک شاعرہ نے پہلا انعام حاصل کیا تھا۔

ادریس بابر کے شاعرانہ اسلوب کا ذکر کیا جائے تو سب سے پہلے جدید ترین غزل کا تصوّر ذہن میں آتا ہے۔ یہ بات شکوک وشبہات سے بالاتر ہے کہ ادریس نے اپنے تازہ لہجے سے غزل کو ایک نئی جہت عطا کی ہے جس کی وجہ سے عوام نے اسے کھلے دل سے قبول کیا ہے۔ظفر اقبال نے مابعد جدید غزل کی بنیاد رکھ دی تھی اور اردو غزل میں انگریزی کے الفاظ متعارف کروائے تھے لیکن ادریس اسے ایک الگ سطح پر لے کے گئے ہیں۔زبان کے معاملے میں ادریس بابر فرسودہ نظریات کو مسترد کرتے ہیں کیوں کہ وہ ہر طرح کے الفاظ میں اپنی تخلیقی توانائی کی مدد سے شعریت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یوں ادریس بابر دورِ حاضر میں اپنے منفرد انداز بیان سے ایک نئے لہجے کی تشکیل کر رہے ہیں۔ادریس نے صرف انگریزی اور دوسری زبان کے لفظوں کو بے موقع محل استعمال نہیں کیا بلکہ انھوں نے جدید دنیا کی تبدیلیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شعر کہے ہیں۔اب لوگ قاصد، مے، ساغر، واعظ سے صرف کتابی حد تک

ہی واقف ہیں۔آج کل گوگل میپ کا زمانہ ہے اور لوگ اکثر ایک دوسرے کو لوکیشن بھیجنے کا کہتے رہتے ہیں جس پر ادریس نے کہا:

وہ لوکیشن شیئر کرے تو کہوں
دل سے درد اتنے فاصلے پر ہے

اس شعر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف لفاظی نہیں کرتے بلکہ ان کے شعر بامعنی بھی ہوتے ہیں۔ادریس کے کئی شعر پڑھ کے لگتا ہے کہ یہ خرافات ہیں لیکن جب گہرائی میں جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بہ ظاہر اوٹ پٹانگ سے لگنے والے شعر ادریس کی زیست کا سارا کرب لیے ہوئے ہیں۔اپنی تحقیق کے دوران ادریس کا یہ شعر میری نظر سے گزرا:

ہیلو! یہ کال کاٹنے سے پہلے اک دفعہ پلیز
ہیلو! فریحہ، فاطمہ، متین کی تو خیر ہے؟

جو مجھے شروع میں تو سمجھ نہیں آیا اور میں سمجھا کہ ''فریحہ فاطمہ متین'' شاید کسی لڑکی کا نام ہے اور یہ ایک عام سا رومانوی شعر ہے لیکن جب میں نے ادریس بابر کے ایک قریبی دوست راز احتشام جو خود ایک جانے مانے شاعر ہیں، سے اس کا مطلب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ادریس بابر کی سابقہ بیوی ناروے میں ہیں اور ادریس کے دو بچے ان کے پاس ہوتے ہیں جن سے وہ انھیں ملنے یا بات کرنے نہیں دیتیں، تو یہاں پہ فریحہ ان کی بیوی ہے اور فاطمہ اور متین ان کے بچے ہیں (شاید یہ ان کے بچوں کے اصلی نام نہ ہوں اور صرف علامتی نام ہوں تا کہ بحر کا تقاضا پورا ہو)۔جب شعر کو اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ایک بہت ہی کرب ناک اور بہترین شعر ہے جس میں اپنے بچوں سے جدا ایک باپ کا دکھ اور کیفیت پوری طرح ظاہر ہو رہی ہے حالاں کہ کہیں بھی کسی کیفیت اور دکھ کا ذکر نہیں ہے۔ادریس بابر کا کمال یہی ہے کہ وہ بنا کہے بھی مصرعے اس طرح بُنتے ہیں کہ قاری کی آنکھوں کے آگے پورا منظر چلنے لگتا ہے۔ناروے میں کئی سال گزارنے کے سبب ادریس کی شاعری میں کہیں کہیں ہمیں نارویجین زبان کے اثرات بھی ملتے ہیں جیسے ان کے ایک عشرے کا نام ''الینا فارس برسڈگ'' ہے جس کا اردو میں مطلب ہے 'دیر سے منایا گیا جنم دن'۔

''الینا فارس برسڈگ''
''جنم دن مبارک
نہیں کہہ پایا
ان میں سے کوئی
اس بار بھی
اس رات بارہ بجے کے دس دن بعد
جب غباروں میں سے ہوا نکل چکی
چیونٹیاں کیک کا نشان چھوڑ گئیں
اس سے پہلے کہ چھری پر زنگ جم جاتا
میں نے موم بتی دانتوں میں دبالی
اور انگلیاں کاٹ کے میز پر سجا دیں۔''

موضوعاتی طور پر تو یہ عشرہ بالکل نیا ہے کیوں کہ اردو شاعری میں محبوب کی عہد شکنی اور وعدہ کرنے کے باوجود نہ آنے پر کلاسیکی سے لے کے جدید شعرا سبھی نے لکھا ہے۔لیکن اس موضوع کو جس جدیدیت سے ادریس بابر نے برتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔جیسے پہلے بیان ہو چکا ہے ادریس کی شاعری کی خاصیت یہ ہے کہ وہ بات کبھی سیدھے طریقے سے نہیں کرتے بلکہ آدھی بات کہہ کے پوری سمجھا دیتے ہیں۔ اس عشرے میں بھی غباروں سے ہوا کا نکلنا، چیونٹیوں کا کیک کو کھانا اور چھری پر زنگ جم جانا انتظار کی کوفت کو بہت خوب صورت طریقے سے بیان کر رہے ہیں اور یہ یقیناً نئے استعارے ہیں جو شاید ہی کسی اور نے اس طرح سے برتے ہوں۔ انگلیاں کاٹ کر میز پر سجا دینا ایک عجیب وحشت کی حالت کا بیان ہے جو ایک منتظر شخص پر گزرتی ہے۔

ادریس بابر کی شاعری میں تنہائی کا بیان ہمیں کثرت سے ملتا ہے۔اس کی وجہ شاید ان کی ازدواجی زندگی کے مسائل ہیں یا ان کی دوہری ہجرت ہے (پہلے پاکستان سے ناروے پھر وہاں اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ کر واپس پاکستان آنا)۔ان سے پہلے بھی بہت سے شاعروں نے تنہائی کا بیان کیا ہے لیکن ادریس بابر نے انھیں اپنے اسلوب میں ڈھال کر ایک نئی تازگی دی ہے۔تنہائی کے حوالے سے ان کا ایک تازہ شعر ہے جسے آج کل ادبی حلقوں میں بہت

پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔

کوئی نمبر ملاؤ، کوئی بھی
کال اٹھائے تو کہنا بات کرے

اس شعر میں ادریس بابر نے اپنے منفرد اسلوب کے مطابق ابہام کے کئی پہلو رکھے ہیں۔ پہلے مصرع میں لفظ ''کوئی بھی'' کو دوسرے مصرع کے ساتھ ''کوئی بھی کال اٹھائے تو کہنا بات کرے'' بھی پڑھا جا سکتا ہے اور پہلے مصرع کے ساتھ بھی ''کوئی نمبر ملاؤ، کوئی بھی'' اس ابہام نے شعر میں حسن بھی پیدا کیا ہے اور ساتھ ساتھ تنہائی کے مضمون کو اور بھی نکھار پیش کیا ہے۔ فریحہ نقوی اس شعر کے بارے میں کہتی ہیں کہ ''پھر اس شعر کا ایک دوسرا مطلب بھی قابل توجہ ہے ''کوئی نمبر ملاؤ'' یعنی میرا نمبر تو وہ نہیں اٹھاتا، تم میں سے کوئی بھی شخص اپنے فون سے اس کا نمبر ملاتا رہے اور جیسے ہی وہ اٹھائے، کہنا کہ یہ لیں بات کریں۔ میرے نزدیک یہ ایک خوب صورت شعر ہے۔ ادریس بابر جس طرح کیفیت کو شعر کرتے ہیں، لاجواب ہے''۔ اس کے علاوہ ادریس بابر نے تنہائی کے لیے ایک عجیب و غریب استعارہ پیش کیا ہے جس کی جتنی داد بھی دی جائے، کم ہے کیوں کہ وہ استعارہ کسی بھی شاعر نے ان سے پہلے پیش نہیں کیا۔ ادریس کہتے ہیں:

ایسی تنہائی کہ دیوار پہ میں
چھپکلی دیکھ کے رونے لگا ہوں

چھپکلی کو دیکھ کر رونا، ایک ایسی کیفیت ہے جو تنہائی کی انتہا کو بیان کرتی ہے۔ اس سے زیادہ کوئی شخص اکیلا کیا ہو سکتا ہے کہ حشرات الارض کو دیکھ کر اسے رونا آ جائے اور اپنی تنہائی یاد آ جائے۔ حالاں کہ اس شعر میں کوئی اور کیفیت بیان نہیں کی گئی مگر شعر کی فضا ایسی ہے کہ یہ سارا منظر فلم کی طرح چلنے لگتا ہے کہ ایک وحشت زدہ شخص کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا ہے اور چھپکلی دیکھ کے اداس ہو گیا ہے۔

ادریس بابر کی شاعری کا سب سے بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ عوامی شاعر ہیں۔ عشرے کی بنیاد بھی عوام کے لیے لکھنے کے مقصد سے کی گئی تھی اور وہ اپنی غزلوں میں بھی ایسے موضوعات کا ذکر کرتے ہیں جو اس جدید دور کے اصل مسائل ہیں۔ ادریس کے اکثر عشرے واقعاتی اور تازہ ترین مسائل کا بیان ہوتے ہیں۔ ان کا ایک عشرہ رجزیہ بین

درج ذیل ہے:

اصل مسائل، ذکر اِی کوئی نہیں
رام، رحیم کو فکر اِی کوئی نہیں
ملا، پنڈت دونو رج کے
گرجیں گرجتے ہیں گج وج کے
اینکر، بینکر، ٹینکر، فوجی
جاہل جنتا، اور من موجی
تاریں ہلانے والی-- کمپنیاں
پتلے نچانے والی-- کمپنیاں
لوگ تو بھوک، بیماری جھیلیں
لیڈر جنگیں/ صلحیں کھیلیں!

اس عشرے میں ان کا مخصوص طنزیہ لہجہ دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے یہاں پہ کوئی نام نہیں لیا لیکن رام رحیم، ملا پنڈت کے استعمال سے صاف پتا چل رہا ہے کہ یہاں پہ پاکستان اور ہندوستان کے مسائل کی بات ہو رہی ہے کہ کس طرح سے عوام کی پروا کسی بھی ملک کے لیڈر کو نہیں ہے۔ لوگ بس جنگ اور صلح کے ذریعے اپنی دکانیں چمکاتے رہتے ہیں۔

ادریس بابر صرف عشروں ہی میں عوامی مسائل کو زیرِ بحث نہیں لاتے بلکہ اکثر غزلوں میں بھی چٹکیاں لیتے رہتے ہیں:

آنے کی چھوڑیں، اَوور ٹایم لگا کر
بھیج دوں گا، ماں جی، جتنا وقت ہو گا

اس شعر میں ادریس نے نہایت خوب صورتی سے یک طرفہ مکالمے کے ذریعے اپنے گھر والوں سے دُور پردیس جا کر کمانے والوں کا کرب بیان کیا ہے۔ ایک شخص اپنی والدہ کو کہہ رہا ہے کہ میرے آنے کی فکر چھوڑیں، جتنا مجھ سے ہو سکا اتنا زیادہ اوورٹائم کر کے آپ کو بھیج دوں گا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ادریس نے جانتے ہوئے لفظ ''اوور

ٹائم'' استعمال کیا ہے تا کہ قاری کو اس بات کا اندازہ ہو کہ اس شخص نے اپنی تنخواہ تو اپنے گھر والوں کو بھیج دی ہے اب وہ معمول سے زیادہ محنت کرے گا جس سے گھر سے دُور کمانے والوں کا کرب صاف ظاہر ہو رہا ہے۔ جہاں تک حکومت کی جابر پالیسیوں کی بات ہے، ادریس انھیں بھی تنقید کا نشانہ بنانے سے گریز نہیں کرتے۔ حالیہ حکومت نے جس طرح آتے ہی میڈیا اور صحافیوں پر پابندیاں عائد کی ہیں، ادریس اس کے بارے میں کہتے ہیں:

یہ تو جگنو کو جیل بھیج دیں گے
کیسے کی اور روشنی کیوں کی

مجموعی طور پر ادریس بابر شاعری میں ایک عمدہ، منفرد اور نیا طرزِ احساس متعارف کروانے میں کامیاب رہے ہیں اور یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ ان کی ایک خوش قسمتی یہ بھی ہے کہ نئے لکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد ان کے ساتھ ہے جو ایک تحریک جیسا تاثر پیدا کر رہی ہے۔ شاید اسے آگے جا کر 'یو ای ٹی تحریک' کے نام سے جانا جائے۔ پہلے مجموعے یونہی کی اشاعت کے بعد ان کے لہجے کی تبدیلی اور رفتار بڑھتی نظر آ رہی ہے اور وہ نئے راستوں کی تلاش میں چٹانیں تراشتے جا رہے ہیں۔ اب یہ وقت ہی بتائے گا کہ ان کا یہ نیا لہجہ اور شاعری کی نئی صنف 'عشرہ' اردو شاعری کا باقاعدہ حصّہ بنے گا یا نہیں، لیکن یہ طے ہے کہ ادریس بابر کا لہجہ بہت ہی منفرد ہے اور مابعد جدید شاعری کو نئی اونچائیاں عطا کرنے کا سہرا انھی کے سر ہے۔

شیخ خبیب احمد

اردو افسانہ: منٹو، بیدی اور غلام عباس

خار

''ہماری تباہی کے قصے سارے شہر میں مشہور تھے۔ میں اور اللہ بخشے تمھارے ڈیڈی ''چوہا گینگ'' کے سردار رہے ہیں۔ ہم نے بہت سے لوگوں کی نیندیں حرام کی ہیں۔ خدا کا شکر ہے جتنی زندگی تمھارے ڈیڈی جی گئے ہیں، اس میں انھوں نے عیش ہی کی ہے۔ ہماری فوج نے شہر کے ہر گھر میں راج کیا ہے۔ کسی ریستوران کے باورچی خانے کو نہیں چھوڑا۔ دالوں کے ڈبے کترنا، سبزیوں میں منہ مارنا، برتن گرانا اور چولھے پر سے پھلانگ کر زمین پر آنا سب بہت یاد آتا ہے۔''

چھوٹا چوہا بڑی دل چسپی سے میری باتیں سنتا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ چوہا گینگ کی بنیاد اس کے ڈیڈی نے رکھی تھی اور میں چوں کہ ان کا خاص دوست تھا، اس لیے ان کے ہر کام کی طرح اس میں بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ ہم نے بڑھ چڑھ کر کئی کارنامے سرانجام دیے۔ ایک مرتبہ ہم نے پوفا ہوٹل پر حملہ کیا۔ وہ حملہ کافی منصوبہ بندی کے بعد وقوع پذیر ہوا تھا۔ تمھارے ڈیڈی بہت ذہین تھے۔ انھیں شروع ہی سے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا اور دوسری طرف میں تھا جو کاغذات کو صرف کترنے کے لیے چراتا تھا۔ اس ہوٹل سے ہمیں ڈھیر سارے اخباری کاغذات ملے۔ بھیا نے پورے گینگ پر سختی سے پابندی عائد کر دی تھی کہ جب تک وہ یہ سارے اخبارات پڑھ نہ لیں گے تب تک کوئی چوہا ان کاغذات کو نہیں کترے گا۔ خیر بھیا جی نے وہ سب اخباری کاغذات دو دن میں پڑھ ڈالے اور پھر ہم سب چوہوں نے مل کر ان کاغذات کی دعوت اڑائی۔

ہم نے گھروں، ہوٹلوں اور ریستورانوں کے علاوہ بینکوں، لائبریریوں اور ہسپتالوں میں بھی اپنے کرشمے

دکھائے ہیں۔ ہمارے گینگ کو کئی بار بھاری مقدار میں رقم بھی ملتی مگر اس کا زیادہ سے زیادہ ہم کیا کر سکتے تھے، اب انسانوں کو پیسے دے کر پھل خرید نے سے تو رہے۔ پھل تو ہمیں اِدھر اُدھر پھرنے سے خود ہی مل جاتا تھا۔ لہٰذا ہم ان تازہ کرنسی نوٹوں کو بھی کتر جاتے تھے۔ ہمارا مقصد کسی کا نقصان کرنا نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ جہاں بھی کوئی غیر ضروری چیز نظر آئے، اس پر دھاوا بول دو۔

بھیا جی اکثر کہا کرتے تھے ''ہم بھلے چور ہیں مگر ہمیں پڑھنا لکھنا چاہیے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ میری آنے والی نسل ان پڑھ اور گنوار ہو اور ہماری طرح چوریاں کرتی پھرے۔ میری کوشش رہے گی کہ میں اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو ایک شاہی زندگی دے کر جاؤں۔''

بھیا کے علاوہ ہمارے گینگ میں ایک نوجوان چوہا ''گھنٹی'' بھی تھا جسے بھیا کو دیکھ کر پڑھائی لکھائی کا شوق ہو گیا تھا۔ اس نے بھیا سے درخواست کی تھی کہ اس کی ڈیوٹی سٹی لائبریری کے علاقے میں لگائی جائے تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کتابیں پڑھ سکے اور ہمارے گینگ کے چوہوں کو نئی تکنیکیں سکھا سکے۔

چھوٹا چوہا جو پہلے تو خاموشی سے میری بات سنتا رہا پھر اچانک بولا ''آپ لوگ دل کے اتنے صاف تھے تو پھر اس چوری کو ہی کیوں اپنا پیشہ بنایا؟'' میں نے اس کو بتایا کہ بیٹا جب آپ کی ضروریاتِ زندگی کسی بھی قیمت پر میسر نہ ہو سکیں تو آپ کو چوری کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اس چیز کی بھی کیا چوری جو زیادتی میں موجود ہو۔ ہم نے کبھی کسی انسان کے منہ سے نوالہ چھین کر نہیں کھایا، ریستوران میں بیٹھے کسی امیر جوڑے کی پلیٹ میں منہ نہیں مارا، اور نہ ہی کسی غریب کے گلاس سے شربت پیا۔ ہم تو بس وہ چراتے ہیں جو انسانوں کے پاس روزمرہ کی ضروریات سے زیادہ ہوتا ہے۔ تم دیکھو کہ تمھارے ڈیڈی ابھی اس دنیا میں نہیں ہیں پر وہ تمھارا انتظام جس مندر میں کر کے گئے ہیں وہاں تمھیں عمر بھر کے لیے کھانا اور کتابیں مفت ملیں گی۔ یہاں پہنچنے کے لیے پاکستان سے بھارت ہجرت کرنا پڑی ہے اور اس ہجرت میں نہ جانے کتنے مشکل مراحل کا سامنا ہوا ہے۔ بھیا کبھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولاد ایک ایسے ماحول میں زندگی بسر کرے جہاں پر چوہوں کی پہچان سوائے چوروں کے اور کچھ بھی نہ ہو اور تم دیکھو اس مندر میں انسان اور چوہے ایک ہی تھالی میں کھاتے ہیں۔ ہمیں بھاگنا نہیں پڑتا، کچھ چرانا نہیں پڑتا، کسی کے طعنے نہیں برداشت کرنے پڑتے

بلکہ دور دراز سے لوگ یہاں پر ہمارا رہن سہن دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔

یہ سب سنتے ہوئے چھوٹے چوہے نے مجھ سے پھر سوال کیا ''مجھے ڈیڈی نے بتایا تھا کہ ہم پہلے بھی راجستھان کے کسی علاقے میں رہتے تھے مگر انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ ہم پاکستان کیوں گئے؟''میں نے جواب دیا کہ ''بیٹا دیکھو ہمارے آباواجداد ہندوستان کے شہر راجستھان کے ہی رہنے والے تھے، ہماری پیدائش بھی اسی شہر میں ہوئی اور ہم لوگوں نے چوہا گینگ کی شروعات بھی اس علاقے سے کی تھی مگر ہمارے گینگ کی شروعات کے کچھ ہی عرصے بعد یہاں کے لوگوں نے چوہوں پر ظلم کرنا شروع کر دیے، چوہا مار ادویات بھی عام ہوگئیں، اس ڈر سے کہ ظلم وزیادتی کی زد میں آکر ہمارا گینگ کہیں مارا نہ جائے تمھارے ڈیڈی اور میں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم پاکستان جا کر اپنا سکہ منوائیں گے اور یوں ہم سب چوہے پاکستان چلے گئے۔''

''اور میرے ڈیڈی جو کسی سے نہیں ڈرتے تھے کیا وجہ ہے کہ وہ آج ہم میں موجود نہیں؟ وہ آپ کی عمر کے ہی تو تھے اور آپ تو ابھی تندرست وتوانا ہیں۔'' بیٹا یہ بھی ایک راز ہے جو شاید تمھیں ابھی تک کسی نے نہیں بتایا کہ تمھارے ڈیڈی کو ایک سازش کے تحت مارا گیا تھا۔ جب ہم پاکستان میں تھے تو ہمارا چوہا گینگ بہت بڑا ہو گیا تھا اور اس کے اندر ہی چوہوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے گینگ بنا لیے تھے جو سب مل کر میرے اور بھیا کے لیے کام کرتے تھے۔ جب تمھارا جنم ہوا تو تمھارے ڈیڈی نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی اولاد کی پرورش اس ماحول میں نہیں ہونے دیں گے۔ ان کے ایک پرانے دوست راجن جو ہمارے گینگ کے ساتھ پاکستان نہیں آئے تھے، ہندو برادری سے تعلق رکھتے تھے اور ایک مندر میں رہتے تھے۔ بھیا جانتے تھے کہ اس مندر میں چوہوں کی صحیح معنوں میں قدر کی جاتی ہے۔ بھیا نے راجن کو پیغام پہنچایا کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ اس مندر میں آجائیں اور یہیں پر اپنی باقی کی زندگی کا گزر بسر کریں۔ اس پر انھیں راجن نے مندر آنے کی دعوت دے دی اور یوں میں، تمھارے ممی ڈیڈی، اور کچھ ساتھی پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آگئے اور راجستھان کے اس مندر میں رہنا شروع کر دیا۔''

میں بالکل نہیں چاہتا تھا کہ ایک بچے کو اس کے باپ کی موت کا واقعہ سناؤں مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ میرے بعد کوئی نہیں ہوگا جو اس بچے کو اس کے باپ کی موت کی حقیقت بتائے کیوں کہ یہ راز صرف میرے ہی سینے میں دفن

تھا۔ لہٰذا میں نے ہمت کی اور اس کو بتایا کہ جب ہم مندر پہنچے تو اس کے کچھ ہی دنوں بعد پرانے گینگ کے کچھ لوگ، جن کا لیڈر ان دنوں گھنٹی تھا، پاکستان سے ہندوستان بھیا کو ملنے آئے اور انھیں راجستھان کے ہی ایک ریستوران کے باورچی خانے میں ملنے کی دعوت دی۔ بھیا نے ان کی یہ دعوت قبول کی اور موقع پر وہاں پہنچ گئے۔ اسی دعوت میں چال بازی سے ان مکار چوہوں نے بھیا کے کھانے میں زہر ملا کر انھیں مار دیا۔ ان چوہوں کو لگتا تھا کہ بھیا نے مندر کے لالچ میں اپنا مذہب چھوڑا اور ایک دوسرا مذہب اپنا لیا ہے اور وہ اسی بات کی خار میں پاکستان سے ہندوستان ان کو قتل کرنے کے لیے چلے آئے تھے۔

یہ واقعہ سن کر چھوٹا چوہا ایک دم طیش میں آ گیا اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسی آگ دکھائی دی جو شاید میں نے کبھی بھیا جی کی آنکھوں میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ یوں لگا کہ جیسے ہی اسے موقع ملے گا اپنے باپ کا بدلہ لینے نکل پڑے گا اور ان ظالموں کو چیر پھاڑ دے گا۔

مومنہ افضل

کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

زلفوں کا سَحر

''شرمین، پلیز جے جے کارپوریشن کی فائل لے کر میرے دفتر میں آ جائیے گا۔'' جمال نے انٹرکام پر اپنی سیکرٹری کو بلایا۔ جواب میں ایک منٹ کے اندر شرمین فائل لے کر آفس میں داخل ہوئی اور مؤدبانہ طریقے سے فائل جمال کی میز پر رکھ دی۔ جمال نے سر اُٹھا کر اسے شکریہ کہا اور جانے کی اجازت دی۔ جوں ہی شرمین جانے کے لیے مڑی تو جمال نے ٹکٹکی باندھ کر اُس کی پشت پر پھیلے حسین اور کالے ریشمی بالوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ شرمین کمرے سے نکل گئی۔ یہ آج کا قصّہ نہیں تھا بلکہ گذشتہ تین ماہ سے اُس کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا تھا۔ ملتان میں پوسٹنگ ہوئے تین ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا اور تین ماہ سے ہی وہ اپنی سیکرٹری کے حسین بالوں میں گم تھا۔

کبھی کبھار وہ تنہائی میں خود پر بے تحاشا ہنستا۔ اُس کے گھر والوں نے اُسے پچھلے دو سالوں میں شادی کے لیے کئی لڑکیوں سے ملوایا مگر کبھی بھی کوئی دل کو نہ بھا سکی۔ اب تنگ آ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا اور یہاں اس کا دل آیا بھی تو کسی لڑکی پر نہیں بلکہ ناگن کی طرح لہراتے کالے سیاہ بالوں پر۔ پہلے تو یہ اُسے محض دل لگی ہی لگی لیکن آہستہ آہستہ اُسے احساس ہوا کہ وہ ان کے سحر میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اب تو نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ وہ سارا دن بِلا ضرورت شرمین کو بے معنی کاموں کے لیے بلاتا تا کہ وہ ان کو ایک نظر دیکھ سکے۔

''شرمین، صبح جو ڈاک آئی تھی، وہ لے کر میرے پاس آ ئیں۔'' حسبِ معمول جمال نے 'گیسوئے تاب دار' کی زیارت کے لیے شرمین کو بلایا۔

'جی سر یہ لیں۔' جیسے ہی شرمین نے ڈاک ان کی میز پر رکھی تو اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ آج شرمین نے

اپنے سر کو حجاب سے ڈھانپ رکھا تھا۔شرمین کی واپسی کو آج بھی اس نے دیکھا لیکن اس طرح جیسے کوئی من چاہی شے کے کھو جانے پر اداسی سے دیکھتا ہے۔

اس کے بعد تو یہ ہر روز کا ہی معمول بن گیا۔شرمین ہر روز حجاب پہن کر آتی اور اس کی اداسی کو مہمیز کر دیتی۔ ان بالوں کو دیکھنے کی بے چینی اس کے رگ وپے میں پھیل جاتی۔اپنی اس کیفیت کو شروع میں اُس نے نظر انداز کیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کیفیت نے اس کے شب و روز کے معمول کو متاثر کرنا شروع کر دیا اور اس کیفیت نے اسے ایک نتیجے میں پہنچنے میں مدد دی۔

بالآخر اس نے اپنے والدین کو شرمین کے گھر رشتہ لینے کے لیے بھیج دیا۔ جسے انھوں نے بلا ردّوقدح قبول کر لیا۔ جمال کو تو یوں لگتا تھا جیسے دونوں جہاں کی خوشیاں اس کے دامن میں سما گئی ہیں۔وہ طرح طرح کے منصوبے بناتا۔وہ کیسے پھولوں کے گجرے ان بالوں میں سجانے کے لیے لایا کرے گا۔کیسے کیسے ہیئر سٹائل بنانے کی فرمائش کرے گا۔

آخر کار وہ خوشی کا دن بھی آ گیا جب شرمین اس کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے داخل ہوگئی۔مہمانوں سے فرصت پا کر جیسے ہی وہ دونوں اپنے کمرے میں پہنچے تو جمال نے اس سے فوراً اپنے بال کھولنے کی فرمائش کی اور زیرِلب مسکراتے ہوئے وہ پھول نکالنے لگ گیا جو اس نے بالوں میں سجانے کے لیے خاص طور پر آرڈر پر بنوائے تھے۔جیسے ہی شرمین نے اپنا ڈوپٹا اتار کر اپنے بالوں کو کھولا تو جمال کو لگا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گا۔خوشی سے نہیں بلکہ صدمے سے۔شرمین گردن تک کٹے ہوئے بالوں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''لیکن تمھارے بال تو بہت لمبے تھے۔'' جمال کے منہ سے بہ مشکل نکلا۔

''وہ تو میں نے 'Extension' لگوا رکھی تھی۔'' شرمین نے بے پروائی سے جواب دیا۔''اور جب میں نے حجاب شروع کیا تو اس کی ضرورت ہی نہ رہی، اس لیے میں نے اتروا دی۔''

ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے گجرے جمال کی طرح کنفیوژ دکھائی دے رہے تھے۔

آرزومہتاب
کریٹورائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

لنڈے کا کوٹ

۲۰۱۰۔۔۔

ستمبر کا مہینہ اختتام پر تھا۔آسمان پر تاریکی چھا گئی تھی۔ابّا پک این ڈراپ سروس سے فارغ ہو کر گھر آئے تھے۔گھر میں تین افراد رہتے تھے،ابّا،امّاں اور میں۔ہمارا یہ غریب خانہ ہمارے لیے محل جیسا ہی تھا۔تقریباً آٹھ بج رہے تھے۔کھانے کا وقت ہو گیا۔برتن کے زور سے رکھنے کے شور سے معلوم ہو رہا تھا کہ امی کا موڈ خراب ہے۔امی اکثر اکتائی ہی رہتی تھیں۔شاید حالات سے تنگ آ چکی تھیں۔امی نے آواز لگائی تو ہم دسترخوان پہ اکٹھے ہو گئے۔نارنجی رنگ کی چٹائی پر تین سٹیل کی پلیٹیں اور تین پانی کے گلاس موجود تھے۔کھانے میں پھر سے دال روٹی ہی نصیب ہوئی تھی لیکن ہم نے صبر شکر سے کھا لیا۔کھانا کھانے میں مصروف ابّا جان نے بات شروع کی۔

''آج بڑا ہی خاص دن ہے۔''

امی اور میں،ابا کی بات کی طرف متوجہ ہوئے۔ابا نے فوراً اپنی بات مکمل کی۔

''میں آج اپنی کمائی سے عید کے کپڑے لایا ہوں۔''

امی نے جھٹ سے ٹوکا:''کیا ضرورت تھی لانے کی،ہمارے پاس ہیں تو سہی۔پچھلی عید والے سوٹ اور اس سے پچھلی عید والا بھی،بالکل نیا ہی تو پڑا ہے۔میں نے تو وہی چلا لینا تھا.....ابّا نے امی کی بات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا،اس بار ہم سب نئے کپڑے ہی پہنیں گے۔''

ابّا نے کھانا ختم کرتے ہی پانی کا گلاس اٹھایا،پھر رومال سے اپنا منھ صاف کر کے ڈکار لی اور اٹھ کر کمرے

کا رخ کیا۔ ابّا کام سے تھکے ہارے آئے تھے اس لیے انھوں نے فوراً سونا چاہا۔ میں نئے کپڑوں کا سوچ کر دل ہی دل میں پھولے نہ سمایا۔

اگلی صبح میں ابّا جان کو ناشتے کے وقت ملا تو ان کو یاد دلایا کہ انھوں نے کپڑے نہیں دکھائے۔ ابّا نے جواب میں بتایا کہ وہ امی کو کپڑا کوٹ سینے کے لیے دے چکے ہیں۔ میں دوڑ کر امّی کے پاس گیا۔ کپڑا بستر پر کھلا پڑا تھا۔ کپڑے کو دیکھ کر میری آنکھوں میں ایک چمک آ گئی۔ کالے رنگ کا ملائم کپڑا میری آنکھوں کو بھا گیا۔ مجھے بے قراری ہونے لگی کہ میرا نیا سوٹ جلدی سے سِل جائے۔

امی کے چھوٹے سے کمرے میں کونے والی شیلف پر امی کی پرانی گھسی پٹی سی سلائی مشین پڑی تھی۔ حالت سے کافی پرانی معلوم ہوتی تھی۔ امی اس کے سامنے کرسی رکھ کر بیٹھ گئیں اور اپنی قریب کی نظر کا چشمہ لگائے، سوئی میں دھاگا پرو کر سوٹ سینے لگیں۔ میں نے امی کو لگاتار دو دن اسی سوٹ کو سیتے دیکھا۔ اتنی نفاست شاید ہی کسی کے ہاتھ میں ہو۔ لگاتار کرسی پر بیٹھنے کے باعث امی کی کمر میں بھی خوب درد ہوئی اور امی نے بعد میں مجھ سے خوب دبوایا۔

چند دن بعد۔۔۔

بڑی عید کا خوش گوار دن آ گیا۔ عید کی نماز ادا کرنے کے لیے میں نے نئے کپڑے پہنے، نیا کوٹ پہن کر مجھے تکمیل کا احساس ہوا۔ خوشی کی لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ عید کی روایات تو چلتی ہی رہیں۔ ہم نے پھوپھو کے گھر کا رخ کیا۔ موسم خوش گوار تھا اور ہمیں رکشہ بھی آسانی سے مل گیا تھا۔ میں نے پہنچتے ہی اپنے کزنز اور پھوپھو کو بڑی خوشی سے اپنے کپڑے دکھائے وہ حیران رہ گئے اور مڑ مڑ کر اس کوٹ کا معائنہ کرنے لگے۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر میرے ہم عمر کزن نے جھٹ سے سوال کیا: ''ارے! آج تو ہیرو لگ رہے ہو۔ اتنا مہنگا کوٹ کہاں سے چوری کیا؟'' اور ہنس دیا۔

مجھے اس کا مذاق بالکل نہ بھایا۔ خوشی کی کیفیت دب سی گئی۔ میری آنکھیں ذرا نم سی ہو گئیں میں نے انھیں بتانا چاہا کہ یہ امی نے خود سلائی کیا ہے اور ابّا کی اپنی کمائی کا ہے۔ اچھی دکان کا ہے۔ لیکن انھوں نے میری کسی بات کو

اہمیت نہ دی اور مذاق میں کوئی نئی بات شروع ہوگئی۔

انھوں نے بھلا یقین کیوں نہ کیا؟ کیوں کہ ہمارے حالات ہمیں مہنگا پہننے اوڑھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور ان کے نزدیک مہنگا کپڑا ہی اچھا کہلاتا تھا۔ غربت نے ہمیں گھیرا ہوا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ ہم لنڈے سے شاپنگ کرتے تھے۔

بہ ہر حال پھوپھو کے گھر سے کھانا کھایا اور گپ شپ کے بعد ہم نے چچا اور خالہ کے گھروں کا رخ کیا۔ وہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال پائی اور اس پر مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ میرے سوٹ پر بہ ظاہر تو کسی نے اپنی رائے نہیں دی لیکن عجیب عجیب شکلیں بنا کر اپنی بات کہہ دی۔

میرا دل بہت بُرا ہوا اور میں گھر جا کر پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ اپنے حالات پر اور اپنے رشتہ داروں کے رویوں پر۔ شاید سب نے مجھے بچہ سمجھ کر میری باتوں کو مذاق میں اڑا دیا۔ کوٹ سے میرا دل اتر گیا اور میں نے اسے بے پروائی سے الماری میں پھینک دیا۔ میں نے ٹھان لیا کہ ان سب کو میں ایک دن ایک بڑا آدمی بن کر دکھاؤں گا۔ میری ماں ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ میں ایک دن ایک بڑا آدمی بنوں گا۔

۲۰۱۲۔۔۔

کچھ وقت گزر، امیری پڑھائی مکمل ہو چکی تھی۔ امّاں، ابّا نے میری تعلیم پر بہت پیسے لگائے تھے۔ ہمارے حالات اب بہتر ہو گئے تھے۔ ابا کا اپنا گاڑیوں کا کاروبار تھا اور میرے پاس بھی اب برانڈڈ کپڑے آ گئے تھے۔ مجھے ایک بینک میں افسر کی اچھی نوکری بھی مل گئی تھی۔ ماضی کی غربت نے بہت کچھ سکھا دیا تھا اور اب ایک خوش گوار زندگی کا آغاز تھا۔

۱۹ اگست ۲۰۱۲ء کی بات ہے۔ بینک میں میرا پہلا دن تھا۔ میں نے سوچا پہلے دن فارمل تیار ہو کر جاؤں۔ میں نے الماری سے ماں کے ہاتھ کا سلائی کیا ہوا کوٹ نکالا اور پہلے دن وہ پہننے کا سوچا۔ جس کوٹ کو میں نے دو سال ہاتھ نہ لگایا تھا، وہ آج بھی مجھے پورا آ گیا۔ میں نے خود اعتمادی سے کوٹ پہن لیا اور آئینے میں اپنی شکل دیکھتے ہوئے

جوش سے کہا۔

''چل بیٹا! تیرے اچھے دن آ گئے ہیں۔''

پہلا دن اچھا گزر رہا تھا، اتنے لوگوں میں مجھے اپنا آپ بڑا اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ لنچ ٹائم ہو گیا، میں کینٹین جا کر بیٹھا تو میرا کولیگ علی میرے ساتھ آ بیٹھا۔ علی نے باتوں باتوں میں ایک بات کہی جس سے میرا پورا دن سنور گیا۔

''Your coat looks quite costly. Which brand is it? And stitching is good too.''

(آپ کا کوٹ کافی قیمتی لگتا ہے، کس برانڈ کا ہے؟ اور سلائی بھی زبردست ہے۔)

میں چونک گیا اور ایک مسکراہٹ میرے چہرے پر طاری ہو گئی۔ چند سیکنڈ خاموشی کے بعد میں نے جواب دیا۔ ''Yes, it is very costly, but......''

''But it is from Landa Market''

علی خوب ہنسا اور کہنے لگا،

''Friend, you are kidding me.''

شیریں عباس
کریٹور ائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

پری

سلمٰی اور منظور قصائی گلی سے باہر نکلے۔ ہاتھوں میں کئی تھیلے لیے ہوئے۔ منظور کالج روڈ سے گرم گرم پلاؤ لے آیا تھا۔ سلمٰی کو موتی بازار سے کچھ کپڑے لینے تھے۔ جہیز کے کچھ سوٹ ابھی تک نہ سلے تھے۔ نکلتے نکلتے اس نے قصائی گلی سے کچھ اور برتن لے لیے۔ چاند کی مدھم روشنی دونوں کو بہت اجلی اجلی معلوم ہو رہی تھی۔ دونوں خوش تھے شاید اس لیے کہ ان کو سب روشن روشن لگ رہا تھا۔ خدا بھلا کرے منظور کے پھوپھازاد بھائی کا، جس نے عین وقت پہ دبئی سے کچھ رقم کا انتظام کر دیا تھا جس کے باعث سلمٰی مزید خریداری کر سکی۔ لڑکے والوں نے کوئی خاص مطالبہ تو نہ کیا تھا مگر سلمٰی کے لیے اچھا جہیز ان کی بیٹی کی عزت کے لیے بے حد ضروری تھا۔

وہ دونوں اندھیرے میں خاموشی سے چلتے رہے۔ منظور دل ہی دل میں پیسے لوٹا دینے کے منصوبے بناتا رہا۔ سلمٰی سوچتی رہی کہ کیا یہ پلاؤ گھر آئے رشتہ داروں اور مہمانوں کو پورا پڑ جائے گا اور اگر نہ پڑا تو پھر جلدی میں کیا پکایا جا سکتا ہے! پہلے ہی گھر میں کچھ نہ تھا پھر شادی کے خرچوں نے کمر توڑ ڈالی۔ خاموشی کو چیرتے ہوئے مینار سے اذان کی آواز آئی۔ بوڑھے مولوی صاحب کی آواز وہ بچپن سے پہچانتے تھے۔ سلمٰی نے اپنی کڑھائی والی چادر مزید زور سے سر پہ کھینچ لی اور دل ہی دل میں حساب کتاب میں مشغول ہونے پر خود کو کوسنے لگی۔ منظور اور سلمٰی دونوں اپنی بیٹی کے نصیب کے لیے دعا مانگنے لگے۔

گھر سے دو گلیاں دور بھی دھیمی ڈھولک کی تھاپ کی آواز آنے لگی۔ تھیلے میں پڑے برتن جب آپس میں ٹکراتے تو ان کی چھنکار بھی ڈھولک کے ساتھ ہم آہنگ ہونے لگی۔ کئی سال پہلے بھی انھی آوازوں سے رات گئے قصائی گلی میں رونق ہوا کرتی تھی۔ سلمٰی اور منظور کو یہ آوازیں بخوبی یاد تھیں۔ وہ یہی آوازیں سنتے بڑے ہوئے تھے۔

سلمیٰ کی ماں اُس کے بچپن میں ہی مر گئی تھی جس کے بعد سلمیٰ کو اپنے تایا کے ہاں بھیج دیا گیا۔ ان کا بیٹا منظور، سلمیٰ سے کچھ ہی سال بڑا تھا۔ مغرب کی اذان ہوتے ہی تائی جان سلمیٰ اور منظور کو گھر سے باہر نہ جانے دیتیں اور کہتی تھیں کہ مغرب کے بعد چڑیلیں بچوں کو کھانے کے لیے نکل آتی ہیں۔ وہ ایک بہت بڑی محفل کا انتظام کرتی ہیں جہاں دیو اور جن گانا بجانا کرتے ہیں۔ بڑے بڑے کالے جادوگر آتے ہیں اور بچوں کو شوق سے کھایا جاتا ہے۔

طبلے کی تھاپ، کھلکھلاتی ہوئی ہنسی، تائی جان ہمیشہ ان موٹی چڑیلوں کے سر ڈال دیتیں۔ منظور اور سلمیٰ مارے ڈر کے قبل از مغرب ہی گھر میں آ کر چھپ جاتے اور مولوی صاحب کی سکھائی ہوئی آیات وغیرہ پڑھتے۔ مولوی صاحب سے ایک دو مرتبہ انھوں نے پوچھا بھی تھا کہ چڑیلیں اس محلے میں کیوں رہتی ہیں اور کہاں سے آئی ہیں، مگر مولوی صاحب بر امان گئے تھے۔

وہ چڑیلیں دو گھر چھوڑ کر رہتی تھیں اور قصائی گلی کے کئی محلوں میں ان جیسی اور بھی تھیں۔ سلمیٰ اور منظور نے ہمیشہ انھیں سیاہ برقعے اوڑھے دیکھا۔ ''اپنی خوف ناک شکل چھپانے کے لیے اوڑھتی ہیں'' تائی جان کہا کرتی تھیں۔ مولوی صاحب کے مدرسے کے شاگرد بھی سلمیٰ اور منظور کی طرح ان کو گلی میں دیکھ کر سہم جاتے۔ جب رات کے وقت ان کی محفل ہوتی، سلمیٰ اور منظور گھر کی اس دیوار سے لگ جاتے جو مولوی صاحب کے مدرسے سے جڑی ہوئی تھی۔ مسجد اُسی کے اوپر بنی تھی۔ رات گئے وہاں سے حفاظِ قرآن کی تلاوت ان کو ہر رات چڑیلوں سے محفوظ رکھتی۔

جب سلمیٰ کی عمر چھے سال تھی، منظور بھی دس سال سے زیادہ نہ ہوگا تو تایا جان نے عمر بھر کی بچی ہوئی کمائی سے تائی جان کو حج کروایا۔ سلمیٰ اور منظور کو ان کی پھوپھی آپا فردوس کے ہاں چھوڑ گئے۔ آپا فردوس کا گھر ان کے گھر کے عین سامنے تھا ان کا امیر شوہر یہ گھر اور دو جوان بیٹے چھوڑ کر مرا تھا۔ اگرچہ اُن کے بیٹے منظور سے دس پندرہ برس بڑے تھے مگر پھر بھی اُن دونوں کی سلمیٰ اور منظور سے بہت دوستی اور پیار تھا۔

تائی جان حج کو گئیں تو چند دن تو کھیل کود میں گزر گئے مگر اس کے بعد بچوں کو بہلانا مشکل ہو گیا۔ کبھی آپس میں لڑ پڑے تو ناخنوں سے ایک دوسرے کو زخمی کر دیا، تو کبھی بلاوجہ ایک دوسرے کو چڑانے کے لیے ایک دوسرے کے کھلونے توڑنے لگے۔ بالآخر فردوس آپا کے بیٹے بلال اور رحمان تنگ آ کر سلمیٰ اور منظور کو صدر لے گئے۔ اس سے

بچے تو بہل گئے اور ان کا مزاج بھی خوش گوار ہو گیا لیکن جب رات گئے وہ ہاتھوں میں غبارے اور کھلونے لیے واپس پہنچے، گلی میں داخل ہوتے ہی طبلے اور گھنگھروؤں کی آواز سے گھبرا گئے۔ خوفزدہ ہو گئے یا شاید تائی جان کی یاد بھی آ رہی تھی۔ دونوں بچے رو پڑے اور چڑیلوں کا قصہ کہہ ڈالا کہ وہ اپنے الٹے پیروں پہ گھنگھرو باندھ کر کیسے محفل میں بچے ذبح کرتی ہیں۔ بلال اور رحمان مسکرائے اور بچوں سے وعدہ کیا کہ انھیں کچھ نہیں ہوگا۔ ان کو نہ صرف چڑیل بھگانے کے منتر آتے ہیں بلکہ پریاں بھی ان کی دوست ہیں اور ضرورت پڑی تو پریاں یہاں انھیں بچانے ضرور آئیں گی۔

اگلی شام جب آپا فردوس ختم قرآن پر پڑوس میں گئیں تو بچے پری دیکھنے کی ضد کرنے لگے۔ بلال اور رحمان بعد از مغرب دونوں کو چڑیلوں کی حویلی میں لے گئے۔ سلمیٰ اور منظور کیا دیکھتے ہیں کہ صحن میں حوض اور فوارے ہیں۔ گلاب کی پتیاں سفید چادر پہ بچھی ہیں۔ خوب صورت شمع دان میں موم بتیاں رکھی ہیں۔ عرقِ گلاب کی خوش بو ہر جگہ تھی اور پھر شبنمی رنگ کی ساڑھی باندھے پری داخل ہوئی۔ اس پر سے نظر ہٹانا مشکل تھا۔ اس کی ساڑھی روشنی میں رنگ بدلتی تھی۔ اس نے بیش قیمت، چمک دار زیور پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر مہندی سے لال تھے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی جسے پڑھنا مشکل تھا۔ شاید اداس تھی۔ وہ بچوں سے بہت خوش ہو کر ملی اور جب بچوں نے اس سے کوہ قاف کے بارے میں پوچھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

آہستہ آہستہ عجیب عجیب ڈراؤنے آدمی آنے لگے اور بلال اور رحمان بچوں کو لیے واپس آ گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ چڑیل کے دیو ہیں جو پری کو کھانے آتے ہیں۔ بچوں سے وعدہ لیا گیا کہ پری کا ذکر کسی کے سامنے نہیں کریں گے۔ کئی ہفتے گزر گئے تائی جان بھی واپس آ گئیں۔ دونوں بچوں نے اکیلے میں بلال اور رحمان سے خوب ضد کی کہ پری سے ملوا دیں مگر وہ انھیں دوبارہ نظر نہ آئی۔ ہاں ایک بار دیکھی تھی، تب وہ سب کو نظر آئی تھی۔ رمضان کے آخری دن تھے۔ سب تراویح سے سحری تک جاگتے تھے۔ اس روز تراویح بلال نے پڑھائی تھی، مولوی صاحب کی طبیعت ٹھیک نہ تھی، وہ نظر نہیں آئے۔ مدرسے میں سو رہے ہوں گے۔ ابھی تراویح پڑھائے کچھ دیر ہی ہوئی ہوگی کہ گلی میں چیخ و پکار کی آواز آئی۔

پری آ گئی تھی، اُس کا سیاہ برقع جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کے قیمتی سوٹ کی آستین پھٹی ہوئی تھی۔ اور ملائم بازو پر جامنی مائل نیلا داغ تھا، بلکہ کئی داغ تھے۔ اس کو چھ بھیڑیا نما لڑکوں نے گھیر رکھا تھا۔ اور اس پہ آوازیں کس

رہے تھے۔تائی جان نے سلمیٰ کو گھر سے نکلنے نہ دیا۔اوپر کے کمرے میں رکھے ہوئے بستروں پر چڑھ کر اس نے یہ منظر روشن دان سے دیکھا تھا۔منظور بلال کے ساتھ مسجد میں ہی تھا اور فوراً نکل آیا تھا۔

''نیل بننے میں کافی دیر لگتی ہے،شاید یہ لڑکے کافی دیر سے پری کا پیچھا کر رہے تھے۔''سلمیٰ نے سوچا تھا۔وہ لڑکے اس کو دھکے مارتے اور آوازیں کستے ، وہ گر پڑی تھی۔اس کے ہاتھ سے گرم پلاؤ کا تھیلا گر کر پھٹ گیا اور اس کی چوڑیاں ٹوٹ کر گلی میں بکھر گئی تھیں۔ایک آوارہ کتا لپک کر پلاؤ کھانے لگا تھا۔ان لڑکوں نے عجیب عجیب باتیں کی تھیں جو سلمیٰ کو سمجھ نہ آئی تھیں۔وہ بار بار پری کو گندی اور بے حیا عورت بولتے۔گرنے کی وجہ سے پری کے نازک بازو اور گال چھل گئے تھے ان سے خون بہہ رہا تھا۔انھوں نے پھر بھی رحم نہ کھایا۔سلمیٰ نے سوچا یہ لڑکے ضرور چڑیل کے دیو ہیں۔

شوروغل کے بیچ پری کے گھر سے مولوی صاحب برآمد ہوئے بنیان اور شلوار میں ملبوس جس کا ازار بند وہ کس کے باندھتے ہوئے گلی میں نکلے تھے۔مولوی صاحب کو واقعی غیب کا علم ہے، بیماری میں بھی جان گئے، پری مصیبت میں ہے،اسی لیے اسے بچانے آئے ہیں۔بچوں نے سوچا۔مگر یہ کیا؟ مولوی صاحب ان لڑکوں کے ساتھ مل کر پری پر لعن طعن کرنے لگے۔وہ کہتے تھے پری نے ان کا ایمان خراب کیا اور انھیں خدا سے دور کیا۔

بلال بھائی اور رحمان بھائی کیوں چپ رہے؟ پری کی آنکھوں میں نا قابلِ فہم کیفیت تھی۔

سلمیٰ رو پڑی۔

پری دوبارہ کبھی نظر نہ آئی مگر مولوی صاحب باقاعدگی سے نظر آئے۔اس روز انھوں نے فجر کی اذان خود دی۔جمعۃ الوداع کا خطبہ شیطان کے وسوسوں اور توبہ کی قبولیت پر دیا گیا۔آہستہ آہستہ رات کو قصائی گلی خاموش ہونے لگی۔تائی کہتی تھیں مولوی صاحب نے منتر پڑھ کر چڑیلوں کو بھگا دیا۔اب رات کو وہاں خاموشی ہوتی تھی۔کبھی کبھی کسی شادی بیاہ کی آواز آتی تھی۔ایسی ہی ایک رات تائی جان نے سلمیٰ اور منظور کا نکاح پڑھوایا تھا اور آج بھی ایسی ہی رات تھی۔دونوں اب خیالات کے بھنور میں بہتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔پتا ہی نہ چلا۔

دلھن پیلے غرارے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ہاتھ میں چند گوٹے کی چوڑیاں تھیں،رحمان بھائی کی بیٹیاں ڈھولک بجا رہی تھیں۔ہر طرف اُبٹن اور تیل کی خوش بو پھیلی ہوئی تھی۔سب کہتے تھے دلھن پر پریوں کا سا روپ چڑھا ہے۔

تائی جان نے کہا ''نام کی تاثیر ہے۔''

حسان شعوانہ

کریٹور ائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

عزت کی کہانی

گاڑی سگنل پر رکی۔ایک نو دس سال کا بچہ گاڑی کی فرنٹ سیٹ کے کھلے شیشے کے پاس آ کھڑا ہوا۔اس کے ہاتھ میں مختلف رنگوں کے پین اور پنسل تھیں جنھیں خریدنے کے لیے وہ اگلی سیٹ پر بیٹھے صمد کی منت سماجت کرنے لگا۔

''معاف کرو۔'' صمد نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ بچے نے مزید اصرار کیا تو صمد نے غصے سے چلّا کر کہا: ''تمھیں سمجھ نہیں آ رہی کہ مجھے یہ سستی چیزیں نہیں چاہئیں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' ساتھ ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے عبید نے دکھ اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ صمد کو دیکھا۔''بری بات بیٹا! ایسے بات نہیں کرتے کسی سے۔'' عبید نے بیٹے کو پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بابا آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ کتنا گندا تھا اور گاڑی کے اندر ہی گھسا آ رہا تھا۔'' صمد نے خفا ہو کر کہا'' آپ اس بچے سے عزت سے بات کرنے کا کہہ رہے ہیں جس کی کوئی عزت ہی نہیں۔''

یہ سن کر عبید پر سناٹا چھا گیا۔اشارہ سبز ہو چکا تھا اور گاڑیاں آگے بڑھ رہی تھیں۔عبید کی گاڑی بھی آگے بڑھ چکی تھی لیکن اس کی سوچوں کا پہیا پیچھے کی طرف دوڑ رہا تھا۔

''اے! کتنے میلے ہو تم۔ پہلے جا کر خود نہا دھو کر آؤ پھر اس میز کو صاف کرنا۔'' چائے پیتے گاہک نے گیارہ سالہ بچے کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا جو کپڑے سے میز کی سطح صاف کر رہا تھا۔ایسی بات اس نے پہلی دفعہ نہیں سنی تھی۔ہوٹل میں آنے والے لوگوں کے لیے وہاں ملازمت کرنے والے گیارہ سالہ 'چھوٹے' کی کوئی عزت نہ تھی۔وہ دن میں کئی بار ایسے جملے سنتا تھا جن سے اس کے ننھے سے دل کا کوئی حصہ ٹوٹ جاتا تھا۔برسوں بعد جب اسے لگا تھا

کہ اب اس کا دل اتنا مضبوط ہو چکا ہے کہ اب مزید کوئی بات اس پر ویسی ضرب نہیں لگا سکتی، تب ہی اس کے بیٹے کی باتوں سے اسے بہت دکھ ہوا۔ نہ جانے اس سے صمد کی تربیت میں کہاں غلطی ہو گئی تھی۔ اس نے اس کے مزاج میں ابھرتے ہوئے غرور اور اپنے سے کم تر کے لیے حقارت بیدار ہوتی محسوس کی تھی لیکن کم عمر جان کر زیادہ اہمیت نہ دی تھی۔ مگر اب پندرہ برس کی عمر میں وہ اسے ناسمجھ کہہ کر جانے نہیں دے سکتا تھا۔

''صمد بیٹا! یاد ہے میں رات تمھیں ایک کہانی سنا رہا تھا جو ادھوری رہ گئی تھی۔'' عبید نے بیٹے سے کہا۔

''جی بابا! وہ جس میں ایک غریب بچہ ہوتا ہے اور اپنی پڑھائی کا خرچہ اٹھانے کے لیے اس کو ایک ہوٹل میں نوکری کرنی پڑتی ہے۔'' اس نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں وہی۔ ابھی سکول پہنچنے میں کافی ٹائم ہے۔ کہانی پوری کروں؟'' عبید نے پوچھا۔

''جی بابا'' صمد نے اشتیاق سے کہا۔

''وہ بچہ ہر روز لوگوں کی بہت باتیں سنتا تھا لیکن ان باتوں کی وجہ سے اس نے کبھی اپنی ہمت کم نہ ہونے دی۔ دل لگا کر پڑھتا اور ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی محنت کی بہ دولت وہ یونیورسٹی میں پہنچا اور اسکالرشپ سے ایم بی اے بھی کر لیا۔ پھر اس کی محنت رنگ لائی اور اسے شہر کی ایک بڑی فرم میں نوکری بھی مل گئی۔ معلوم ہے کہ اس سارے سفر میں اسے کس چیز کی کمی محسوس ہوتی رہی؟''

''کس چیز کی؟'' صمد نے، جو بہت غور سے سن رہا تھا، بے چینی سے پوچھا۔

''عزت کی'' عبید نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ زندگی میں اتنا کچھ حاصل کر کے بھی اسے عزت نہیں ملی۔'' صمد کو کچھ سمجھ نہ آیا۔

''لوگوں سے تو عزت ملی لیکن انھی لوگوں سے اسے اتنی بے عزتی ملی کہ اب ان کی عزت سے اسے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اس کے لیے وہ عزت اہم تھی جو اس نے اپنی نظر میں اپنے لیے کمائی تھی۔ محنت اور ایمان داری سے اور کسی کے آگے کبھی ہاتھ نہ پھیلا کر۔'' عبید نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

’’تمھیں کیا لگتا ہے صمد، عزت کیا ہوتی ہے؟‘‘ عبید نے پوچھا۔

’’لوگوں کے نزدیک ہمارا ایک اچھا مقام۔‘‘ اس نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا۔

’’نہیں بیٹا! لوگوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ ہمارا مقام بتائیں۔ اگر ہم نے ایک اچھا مقام حاصل کرنے والے اعمال کیے ہیں تو ہماری عزت اللہ کی نظر میں خود بڑھ جائے گی۔‘‘ عبید نے بات کو سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

عبید نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ’’اسی طرح ہمیں بھی یہ حق حاصل نہیں کہ ہم کسی کو اس کی مالی حیثیت، ظاہری حالت یا کسی بھی وجہ سے خود ساختہ عزت کے پیمانے سے پرکھ کر اس کے مطابق سلوک کریں۔‘‘

صمد اب سمجھ چکا تھا کہ بابا کا اشارہ اس کے اس سگنل والے بچے کے ساتھ سلوک کی طرف تھا۔

’’کیوں کہ‘‘ عبید نے بات جاری رکھی، ’’کیا پتا کہ ہماری کسی ایسی بات کی وجہ سے کسی کا دل اتنا ٹوٹ جائے کہ وہ ہمت ہار دے۔ جیسے اگر اس ہوٹل پر کام کرنے والے بچے نے دل برداشتہ ہو کر زندگی میں آگے بڑھنے کی امید ترک کر دی ہوتی تو وہ آج اپنی گاڑی میں، اپنے بیٹے کو شہر کے سب سے بڑے سکول کے دروازے پر ڈراپ نہ کر رہا ہوتا۔‘‘

عبید نے اسکول کے گیٹ پر آ کر گاڑی روکی۔

اس کی آخری بات کو سمجھنے کی کوشش میں صمد نے ششدر نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

’’بابا۔‘‘ اس کو سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔

’’ہاں ہاں چلو۔ باقی باتیں بعد میں۔‘‘ عبید نے پچھلی سیٹ سے اس کا بیگ اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ اور صمد نے نم آنکھوں سے بیگ لیا اور دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ فی الحال تو بابا سے نظریں ملانے کی ہمت نہ تھی۔ عبید نے دیکھا کہ اس نے آگے بڑھ کر گیٹ پر کھڑے سیکورٹی گارڈ سے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملا کر سلام کیا اور آگے بڑھ گیا۔

ایمن خضر

کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

واپسی

دھک کی آواز سے دروازہ کھلا اور ایسا محسوس ہوا جیسے چاند زمین پر اتر آیا ہو۔ سرخ وسفید رنگت اور اس پر سرخ جوڑا، ایسا لگتا تھا جیسے بہار کے موسم میں گلاب کھلے ہوں، بڑی بڑی آنکھوں کے گرد پھیلا ہوا کاجل شاید کسی کو بھی محصور کر لیتا۔ بال گویا سیاہ ریشم، کوئی دھوپ میں دیکھے تو آنکھیں چندھیا جائیں۔ باہر ٹیکسی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اس میں سوار ہو کر چلی گئی۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ دنیا سو رہی تھی اور حسن آرا منزل میں ابھی دن چڑھا تھا۔ پورا گھر سنہری بتیوں کی لڑیوں سے ٹمٹما رہا تھا۔ اچانک پورے گھر میں شور برپا ہوا اور ''دل رُبا''، ''دل رُبا'' کی آوازیں گونجنے لگیں، مگر دل رُبا تو جا چکی تھی۔ شاید کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔

آج اس سے پہلی بار وہ کام لیا جانا تھا جس کے لیے بچپن سے وہ اپنی ماں کو استعمال ہوتا دیکھتی آئی تھی۔ اس کی ماں جہاں آرا بازارِ حسن کی مشہور ترین طوائف تھی، لہٰذا اس کا چرچا بھی دور دور تک پھیل گیا۔ کئی بولیاں لگیں۔ بہت سے جاگیرداروں، سیاست دانوں اور امیر زادوں نے بڑی بڑی قیمتیں پیش کیں مگر ذلت کی زندگی اسے قبول نہ تھی۔

قریبی مسجد کے امام صاحب اکثر اپنا فریضہ سمجھ کر دین کی دعوت دینے ادھر چل نکلتے۔ ان لوگوں کے دھتکارنے اور طنز سے بھی ان کو کوئی فرق نہ پڑتا کیوں کہ بہ قول ان کے وہ قیامت کے دن خدا کی دھتکار سے امان پانا چاہتے تھے۔ ان کی کوئی بات شاید دل رُبا کے دل میں گھر کر گئی اور اس نے بھاگ کر ان کے گھر میں پناہ لے لی۔

امام صاحب کی بیوی اور بیٹی امن جلد ہی اس کے ساتھ گھل مل گئیں اور وہ ہنسی خوشی ایک عام سی زندگی ان

کے ساتھ گزارنے لگی۔ اس کو امن کے سکول میں داخلہ مل گیا۔ دونوں سہیلیاں اکٹھے سکول آتی جاتیں۔ سارہ دن ہر کام مل جل کر کرتیں اور ایسے ہی تیزی سے دن گزرنے لگے۔

آج بھی وہ اور امن روز کی طرح تیز تیز قدم اٹھائے سکول سے لوٹ رہیں تھیں۔ ابھی گھر کے نزدیک ہی پہنچی تھیں کہ یک دم زمین نے گویا اس کے قدم جکڑ لیے۔ ایک لمحے کے لیے وہ سانس لینا بھول گئی۔ ''یہ تو وہی تھا'' اس نے سوچا۔ یہ جہاں آرا منزل باقاعدگی سے آنے والے لوگوں میں سے تھا۔ اس کو یاد آیا کہ جب بولیاں لگ رہی تھیں تو اس نے بھی ایک بڑی رقم پیش کر کے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور وہ اس کو روز سکول کے راستے میں دکھائی دینے لگا۔ خوف اور پریشانی سے اس کی دھڑکن تیز ہو جاتی مگر اس نے کسی کو اس بات کا پتا نہ چلنے دیا۔ وہ امام صاحب کو مزید تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی کیوں کہ پہلے ہی وہ ان کے احسانات تلے دبی ہوئی تھی۔

شدید سردیوں کے دن تھے۔ امتحان قریب تھے اور امن شدید بخار میں مبتلا تھی۔ ابھی صحیح طرح دن بھی نہ چڑھا تھا اور اس کو پہلی بار تنہا سکول جانا تھا۔ استانی صاحبہ کی ڈانٹ سے بچنے کے لیے وہ صبح صبح سب کو خدا حافظ کہہ کر سکول کی جانب روانہ ہو گئی۔ وہ اپنے خیالات میں گم بے فکری سے چل رہی تھی کہ پھر سے وہ دکھائی دیا۔ وہ خوف کے عالم میں تیز تیز قدم اٹھانے لگی مگر اچانک کسی نے پیچھے سے اس کا بازو کھینچا، اس کی چیخ نکل جاتی مگر ایک ہاتھ نے اس کا منھ دبوچ لیا۔ دور دور تک کوئی انسان نظر میں نہ تھا۔ اس نے پورا زور لگایا مگر خود کو اس کی گرفت سے چھڑا نہ پائی اور اس کو ایک قریبی گھر میں دھکیل دیا۔ کچھ دیر بعد جب اس کو وہاں سے باہر پھینکا تو وہ کہیں جانے کے قابل نہ رہی تھی۔ اس خون آلود، لٹی پٹی حالت میں دنیا تو کیا امام صاحب نے بھی اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ زیادتی کا پرچہ بھی نہ کٹایا گیا کیوں کہ امام صاحب اسے زیادتی ماننے کو تیار نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے خون میں مسئلہ تھا۔

اسی رات اس کا سامان باندھ کر اس کو گھر سے چلتا کر دیا گیا۔ وہ صدمے کی ماری بے منزل ادھر ادھر دھکے کھاتی رہی، آخر جب چلنے کی سکت نہ رہی تو ادھر ادھر کوئی پناہ گاہ تلاش کرنے لگی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا مگر دور ایک بنگلے پر بہت سی سنہری بتیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ اس کے قدم تیزی سے حسن آرا منزل کی جانب بڑھنے لگے۔

بریرہ گلزار
کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

یادیں

بارش کی آواز سے میری آنکھ کھلی تو علی کو بالکونی میں پایا۔علی اپنی امی کی تصویر ہاتھ میں پکڑے اُداس بیٹھا ہوا تھا۔اس تصویر کو دیکھتا، پھر بارش کے منظر کو۔ دراصل جب وہ چھوٹا تھا تو اس کی امی اس کو ہمیشہ بارش میں نہلانے لے کر جاتیں۔اور جب بھی بارش ہوتی تو قدرت کے ان مناظر کی قدر کرنا سکھاتیں۔علی کو آج بھی بارش میں اتنا ہی سکون ملتا جتنا اپنی امی کی موجودگی میں ملتا تھا۔

علی کی امی مریم بی بی پینتیس برس کی تھیں جب ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کو کینسر ہے جو اپنی آخری سٹیج تک پہنچ چکا ہے۔علی اس وقت سات برس کا تھا اور اس کے اور کوئی بہن بھائی نہ تھے۔ وہ دن کا زیادہ وقت اپنی امی کے ساتھ گزارتا اور جب وہ ہسپتال جاتیں تو وہ گھر بیٹھا ان کی راہ تکتا رہتا۔علی کو مصوری کا بہت شوق تھا،تو اس نے اپنی امی کی تصویر بنائی جس میں وہ خوب صورتی سے مسکرا رہی تھیں۔ یہ تصویر آج بھی ہمارے گھر میں لگی ہوئی ہے۔

علی اپنی امی کے ساتھ ہی سوتا جو اس کو کہانیاں سناتیں۔علی کو آج بھی وہ کہانیاں یاد ہیں اور حمزہ کو سُلاتے ہوئے یہ ہی کہانیاں سناتا ہے۔ میں علی کی امی سے کبھی ملی نہیں مگر جیسے انھوں نے اپنے بیٹے کی پرورش کی ہے، بہت عظیم خاتون معلوم ہوتی ہیں۔علی آج بھی اپنی امی کی وفات کے دن کو بہت غمگین ہو کر مناتا ہے۔

’’مجھے وہ دن آج بھی اچھی طرح یاد ہے میں کیسے بھول سکتا ہوں آمنہ۔ میری ماں اس دن مجھ سے جدا ہوئی تھیں‘‘۔علی اپنی امی کے ساتھ سو رہا تھا کہ بیچ رات کسی بُرے خواب کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ مارے ڈر کے

اس نے اپنی امی کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ اٹھیں۔ ''امی جان! امی جان!'' علی کی آوازیں سن کر اس کے گھر والے جمع ہو گئے۔ انھوں نے مریم بی بی کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ اٹھیں۔ پھر روتے ہوئے علی کو دوسرے کمرے میں بھیجا گیا۔جس کے بعد اس کی امی کے جنازے کی تیاریاں شروع کی گئیں۔علی کو آج بھی اپنی امی کے چہرے کا نور یاد ہے۔اس وقت بھی وہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھیں، جب ان کا جنازہ لے کر جایا جا رہا تھا تو بارش ہونے لگی۔ اسی لیے بارش کی آواز سے علی کی ساری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔اس کی امی کا پیار، اس کی امی کا جنازہ۔

آمنہ احمد

اردو افسانہ: منٹو، بیدی اور غلام عباس کے افسانوں کا خصوصی مطالعہ

ادھورا سچ

لذیذ کھانوں کی خوش بو پھیلی ہوئی تھی۔ فضا میں عجیب سا سرور تھا۔ ریستوران کی بتیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ سلیم روڈ والے اپنی ماہانہ دعوت کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح مرد کسی سیاسی موضوع پر بحث کر رہے تھے اور عورتیں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ اچانک وقار علی صاحب کا ذکر چل پڑا۔

''ہائے، تمھیں کیا پتا کہ میں نے اس دفعہ آخر کار ہمت کر کے وقار صاحب کو محفل میں آنے کی دعوت دے ہی دی'' ڈاکٹر ہمدانی کی بیوی طاہرہ نے بولنا شروع کیا۔

''کیا! سچی؟ تم ان کے گھر گئی؟ تم نے ان کو دیکھا؟ میں نے تو ان کو چار مہینے سے نہیں دیکھا'' ثنا بولی۔

''نہیں نہیں۔ اتنی ہمت تو ہم میں بھی نہیں۔ میں دعوت نامہ ان کے دروازے کے نیچے سے گھسا کر آ گئی تھی کل'' طاہرہ نے جواب دیا۔

''پھر تو انھوں نے اسے دیکھا بھی نہیں ہوگا۔ میں نے تو سنا ہے کہ وہ تین تین دن تک بستر سے نہیں نکلتے'' خان صاحب کی بیوی سارہ بولی۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ احمقانہ باتیں نہ کرو۔ لیکن میں یہ بات مانتی ہوں، وہ ہیں بڑے عجیب۔ دس سال ہو گئے ہیں اور میں نے ان کو گن کر دس پندرہ مرتبہ دیکھا ہوگا'' شازیہ نے کہا۔

''ہاں، حالاں کہ وہ ہمارے ساتھ والے گھر میں ہی رہتے ہیں۔ میں نے ان کو گھر سے باہر کم ہی دیکھا ہے۔ ان کے گھر کے پردے اور کھڑکیاں تک نہیں کھلی ہوتیں۔ بس کبھی کبھی ان کو گھر کا سودا سلف لاتے دیکھا ہے''

طاہرہ نے بولا۔

''سنا ہے جب سے ان کی اپنی بیوی سے علیحدگی ہوئی ہے، تب سے ان کا یہی حال ہے۔'' فرخندہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''بے چارے کو دوسری شادی کر لینی چاہیے۔ میں نے تو سنا ہے کہ ان کی ایک بیٹی بھی ہے لیکن وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی.........'' ثنا کہنے لگی۔

''ارے نہیں بھئی، میں نے تو سنا ہے کہ ان کی بیٹی پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی''، سلمیٰ نے جھٹ سے اسے ٹوکا۔

''نہیں تو!'' ثنا بحث کرنے ہی لگی تھی کہ شازیہ زور سے بولی:

''اف ہو! چاہے جو بھی ہوا ہو، ہمیں کیا۔ ہمارا اس سے کوئی لینا دینا نہیں۔ چلو یہ باتیں چھوڑو''۔

''لیکن وقار صاحب ہیں تو ہمارے محلے کا حصہ، ایسے مشکوک آدمی پر نظر رکھنا ضروری ہے'' فرخندہ نے کہا۔

''ارے کون مشکوک آدمی؟ کسکیبات ہو رہی ہے؟'' ڈاکٹر ہمدانی متوجہ ہو کر بولے۔ مردوں کی سیاسی گفتگو میں وقفہ آ گیا۔

''بس ہماری گلی کے وقار صاحب اور کون؟''

''نہیں نہیں۔ میں نے ایک دفعہ ان سے بات کی تھی۔ برے آدمی نہیں لگ رہے تھے'' ڈاکٹر ہمدانی بولے۔

''آپ تو چھوڑ ہی دیں۔ تیس سیکنڈ کی گفتگو سے آپ کو ان کے کردار کے بارے میں کیا پتا؟ طاہرہ نے کہا اور اس سے پہلے کہ اس کے شوہر کچھ اور بولتے، جلدی سے موضوع بدل گیا اور محفل پھر پہلے کی طرح جم گئی۔

اس بات کو دو چار روز ہی گزرے تھے کہ اپنی بیٹی کو سکول سے گھر لاتے ہوئے طاہرہ نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ وہ حیرت سے ششدر رہ گئی۔ ادھر وقار صاحب گلی کے کونے میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہنستے ہوئے کسی لڑکی کے ساتھ گھوم رہے تھے۔ لڑکی اٹھارہ برس کی معلوم ہو رہی تھی۔ لمبے بال، غزالی آنکھیں، گلابی ہونٹ اور تیکھے نقش اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ طاہرہ فوراً گھر گئی اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے چھپ چھپ کر انھیں دیکھنے لگی۔ اسے ایک اور دھچکا لگا جب وقار صاحب اس لڑکی کو اپنے گھر لے گئے۔ وہ کافی دیر کھڑکی کے ساتھ چپکی رہی۔ اتنا کہ وہ گھر کا

کھانا تک پکانا بھول گئی۔شام کو جب ڈاکٹر ہمدانی واپس آئے تو وہ تب بھی ادھر کھڑکی کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔

''السلام علیکم! کیسی ہے میری پیاری بیوی؟''انھوں نے آ کر طاہرہ کو چوما۔

''ڈارلنگ، آج تو میں ہکا بکا رہ گئی۔آپ کو پتا ہے؟ وقار صاحب تو بڑے شوقین مزاج کے آدمی نکلے۔ میں نے انھیں ایک کم سن لڑکی کے ساتھ بے تکلفی سے گھومتے ہوئے دیکھا۔ یہاں تک کہ وہ اسے اپنے گھر بھی لے گئے اور ابھی تک وہ باہر نہیں نکلے!''

''کیا؟ مجھے تمھاری بات پر یقین نہیں۔تم نے ضرور کسی اور کو دیکھا ہوگا۔ ہمارے وقار صاحب تو شریف آدمی لگتے ہیں۔وہ ایسی حرکتیں بالکل نہیں کر سکتے۔''

''میری بات مانیں، میں بھی پہلے سمجھی کہ میں غلط دیکھ رہی ہوں لیکن وہ وقار صاحب ہی تھے۔اور دیکھیں آج تو ان کے گھر کی بتیاں بھی جل رہی ہیں۔''

''واقعی؟ شاید تمھیں کوئی غلطی فہمی ہوئی ہو اور اصل میں ایسا نہ ہو؟ چلو چھوڑو۔مجھے کھانا لگا دو۔''

''وہ اصل میں........ میں کھانا بنانا بھول........''اور اسی طرح وہ ایک اور بحث میں پڑھ گئے۔

اگلے روز پھر سکول سے اپنی بیٹی کو گھر واپس لاتے وقت طاہرہ نے وہی منظر دیکھا۔اس مرتبہ وقار علی اس لڑکی کے گرد اپنی شال لپیٹ رہے تھے اور طاہرہ پھر پریشان، اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہر روز محلے میں وقار صاحب اور وہ لڑکی پھرتے اور وقار صاحب کے گھر واپس جاتے۔اب تو ان کے گھر کی کھڑکیاں اور پردے بھی کھلے رہنے لگے تھے۔پورے محلے میں وقار صاحب اور اس لڑکی کے چرچے ہونے لگے۔محلے والوں نے قیاس آرائیاں شروع کر دی تھیں۔یہاں تک کہ اگلی ماہانہ دعوت میں سب نے اسی بات کو اپنا موضوع بنایا ہوا تھا۔

''وقار علی صاحب تو بڑے غیر مہذب آدمی نکلے''فرخندہ نے کہا۔

''ہاں اس عمر میں ایک ایسی چھوٹی لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہے ہیں، کتنے واہیات آدمی ہیں؟ اور وہ لڑکی، وہ بھی کتنی بد کردار ہے، مطلب اتنی کم عمر میں اتنے بڑے آدمی کے ساتھ........''سلمٰی بولی۔

''آج تو حد ہی ہو گئی۔میں نے ان کو اس لڑکی کے گال پر چومتے ہوئے دیکھا! سرِ عام! گلی میں! اب ہمیں

کچھ کرنا ہوگا۔ پہلے میں برداشت کر رہی تھی لیکن اب ایسا نہیں چلے گا!'' طاہرہ زور سے بولی۔ ''ہمارے بچے یہ سب دیکھ کر متاثر ہو سکتے ہیں۔ ہمیں ان سے اب بات کرنی ہی پڑے گی!''

سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور فیصلہ کیا کہ وہ اگلے دن وقار صاحب کے گھر جا کر ان سے بات کریں گے۔

اس رات ڈاکٹر ہمدانی اور طاہرہ سو رہے تھے کہ اچانک ایمبولینس کی آواز آئی۔ وہ چونک کر اٹھے اور فوراً باہر بھاگے۔ باقی محلے والے بھی ان کی طرح اپنے گھروں سے باہر نکل رہے تھے۔ ایمبولینس وقار صاحب کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ تفتیش کرنے پر پتا چلا کہ وقار علی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ ڈاکٹر ہمدانی فوراً آگے بڑھے، انھوں نے پیرامیڈک سے کہا:

''میں ان کا ہمسایہ ہوں اور ایک ڈاکٹر بھی، میں زیادہ بہتر.......''

''نہیں، ایمبولینس میں ان کے ساتھ صرف خاندان کے افراد آ سکتے ہیں۔ اور ویسے بھی ان کی بیٹی ان کے ساتھ آ رہی ہے'' پیرامیڈک نے جواب دیا۔

''بیٹی؟ کون سی بیٹی؟'' محلے والے بڑبڑائے۔

''وہ آپ کے پیچھے۔ ارے بھئی۔ اس کو جگہ تو دیجیے''

اور وہی لڑکی آگے بڑھی۔ وہی لمبے بال، غزالی آنکھیں، گلابی ہونٹ اور تیکھے نقش.........!

سیدہ صدف یاسمین

کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

اٹلانٹس

بچپن سے نئے کارنامے سر انجام دینے کے شوق میں ہم ہر چیز میں ٹانگ تو اڑاتے ہی تھے مگر اس بار غلطی سے گردن پھنسا بیٹھے۔ ہوا کچھ یوں کہ ہم نے بڑے بھائی سے سوال کیا کہ وہ کون سا کام ہے جو ابھی تک پورا نہیں ہو سکا جس پر ہم اپنا تحقیقی مضمون لکھ سکیں اور کورس میں بھی نام روشن کریں اور دنیا میں بھی۔ کہنے لگے یہ تو بہت آسان ہے۔ پرانے وقتوں میں ایک شہر ڈوب گیا تھا اٹلانٹس نام تھا اس کا۔ وہ ڈھونڈ لو! لوگ عش عش کر اٹھیں گے۔ ہم نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ اٹلانٹس دریافت کرنے کی ٹھان لی۔

بھائی نے رستہ سمجھا دیا کہ سپین میں جنوب کی جانب سیدھا جانا ہے آگے سمندر آ جائے گا دو چار غوطے لگانا ان شاء اللہ جلد اٹلانٹس نظر آ جائے گا۔ پھر اسے رسی سے باندھ کر باہر نکال لینا۔ ساتھ ہی انھوں نے رسی کا گولا ہمارے حوالے کیا۔ ہم نے ان کی ساری ہدایات من وعن یاد کر کے دو چار مرتبہ دل میں دہرائیں اور سوئمنگ سوٹ پہنے اپنے اوپر آکسیجن ٹینک باندھے رسی اور ماسک وغیرہ کے ہمراہ ساحل پر پہنچ گئے۔ گھڑی پر آخری بار نظر دوڑائی اور آکسیجن ختم ہونے کے دورانیے کو اپنی ڈیڈ لائن کے برابر کیا۔ اللہ کا نام لے کر چشمہ آنکھوں پر چڑھایا اور کسی ماہر غوطہ خور کی طرح دور سے دوڑتے آئے۔ عین اس جگہ جہاں پانی نے ہمارے پاؤں کو چھوا ہم نے اپنا جسم برف بنتا محسوس کیا۔ بھائی صاحب فرصت سے ہمارے غوطہ لگانے کے انتظار میں تھے تا کہ رخصت ہو سکیں۔ ہم نے ایک مرتبہ پھر اٹکتی سانسوں سے ان کی جانب دیکھا ''آپ کو یقین ہے نا مجھے اٹلانٹس مل جائے گا؟'' ہم نے بڑی لجاجت سے سوال کیا اور انھوں نے کمال بے فکری سے جواب دیا ''ہاں ہاں کیوں نہیں، ہمیں لمز والوں پر پورا بھروسا ہے۔ کام مکمل کیے بغیر

واپس نہیں آئیں گے۔ اوہ ہاں واپسی کا رستہ یاد کر لو، فلاں ٹرین سے گھر واپس جانا ہے‘‘ ہمارا حوصلہ بندھا کر انھوں نے ہمیں زوردار دھکا دیا اور ہم نے خود کو اٹلانٹس کی طرح سمندر میں ڈوبتے پایا۔

پہلے تو دل کی دھڑکن بحال کر کے ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کی پھر ہمارے ذہن میں بجلی کا کوندا لپکا۔ بھئی اگر اٹلانٹس بھی ادھر ہی ڈوبا تھا تو اس نے یقیناً ہاتھ پیر تو نہیں مارے ہوں گے۔ اس لیے ہمیں بغیر ہاتھ پیر مارے آرام سے پانی کے ساتھ بہنا چاہیے۔ یقیناً یہی اٹلانٹس تک پہنچنے کا مختصر ترین رستہ ہوگا۔ بس پھر کیا ہم سینے پر بازو باندھے پانی میں ڈوبتے گئے ساتھ ساتھ سمندر کے نظاروں پر سبحان اللہ کہتے ہوئے ثواب بھی کماتے رہے۔ سوچا اٹلانٹس کو باہر نکالنے کے بعد ایک عدد کالم ان خوب صورت نظاروں پر بھی لکھیں گے۔ پھر سوچا اٹلانٹس نکالنے کے بعد تو ہمارے پاس وقت ہی نہیں بچے گا۔ جب ہم باہر جائیں گے تو لوگ دانتوں میں انگلیاں دبا لیں گے۔ اتنا بڑا شہر ایک ’’لمز والے‘‘ نے دریافت کر لیا! واہ واہ سبحان اللہ! پھر ہر طرف ٹی وی پر خبریں چلیں گی پھر ہمارے انٹرویو ہوں گے۔ ہمیں ملک وقوم کا نام روشن کرنے پر اعزازات سے نوازا جائے گا اور آخر میں ہمیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دے دی جائے گی۔ بس ہمارا مقصد تو آخر والا تھا باقی سب تو بونس پوائنٹ ہوں گے۔

ہم انھی سوچوں میں گم تھے کہ ہماری واٹر پروف گھڑی بولنے لگی۔ ہاں بالکل ایسی ہی بیپ بج رہی ہوگی جب ہمیں سٹیج پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لیے بلایا جائے گا۔ پھر اچانک ایک خیال کے تحت ہم نے گھڑی پر دیکھا تو دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا۔ یعنی ہماری آکسیجن مع ڈیڈ لائن ختم ہونے میں صرف کچھ وقت باقی رہ چکا تھا۔ ایک دم ہمارے دماغ کے سارے خانے کسی چراغ کی مانند جل اٹھے۔ ہم نے ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر اٹلانٹس ندارد! وقت صرف اتنا بچا تھا کہ ہم واپس سطح تک پہنچ سکتے ورنہ ہمیں بھی اٹلانٹس کے ساتھ ہی دفن ہونا پڑتا۔ ہم نے سوچے سمجھے بغیر واپسی کا سفر طے کرنا شروع کر دیا۔ سمندر کی لہریں خوابوں پر خوب پانی پھیر رہی تھیں اور شاید کہیں نیچے چھپا اٹلانٹس بھی ہماری ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا منہ چڑا رہا تھا۔ لیکن میرا ذہن اس سب سے آگے صرف ایک سوچ پر اٹکا تھا، کورس میں کیا بہانہ کریں گے؟ جوں توں ہم نے واپس سطح سے سر باہر نکالا زندہ بچ جانے پر شکر ادا کیا اور باہر نکل کر بھائی کے دیے گئے پتے پر پہنچے۔ گھر پہنچتے ہی ہمارے کان سے ایک آواز ٹکرائی ’’اٹلانٹس لبھا ای؟‘‘ اور ہم دانت پیس کر رہ گئے۔

بھائی جان بھی سامنے بیٹھے مسکرا رہے تھے ''اولمز والو اٹلانٹس لے آئے ہو؟'' ہم نے بھی پوری ڈھٹائی سے دانت نکالتے ہوئے کہا'' آپ نے رسی چھوٹی دی تھی۔اس نے کہا تم چلو میں پیچھے ہی آ رہا ہوں''۔ پھر لیپ ٹاپ کھولا اور تحقیقی مضمون میں اپنا مقالہ لکھنا شروع کیا ''اٹلانٹس ایک ایسا شہر ہے جو کئی صدیوں پہلے غرق ہوا تھا اور اس کو دریافت کرنے کا واحد ذریعہ ہے خود غرق ہو جائیں! ان شا اللہ آپ اٹلانٹس تو ضرور دریافت کر لیں گے ہاں مگر ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہیں لے پائیں گے کیونکہ اس کے لیے زندہ رہنا شرط ہے!'' چوں کہ ہمیں ڈاکٹریٹ کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے لہٰذا ہم اس تحقیق سے دست برداری کا اعلان کرتے ہیں۔شکریہ!

محمد حارث ارشد

کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

شناخت

''ارے او چندا۔۔۔! چندا بیٹی۔۔۔! جلدی سے دیگچے کو چولہے پر چڑھا دو۔۔۔اور ہاں سویاں بن گئی کیا۔۔۔؟''

''ہاں اماں۔۔۔۔۔بس تقریباً تیار ہونے کو ہیں۔''

''یہ کم بخت ظفر، عید کی نماز کے بعد گھر ہی نہیں آیا'' سلطانہ بیگم اپنے ہاتھ میں مٹھائی کی بھری پرات لیے گھر کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں گھوم رہی تھی اور ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھی، کہ ہر چیز صحیح طور پر اپنی جگہ سج چکی ہے یا نہیں۔ اس کی بیٹی چندا بھی اس کے ساتھ گھر کو سجانے اور کھانے پکانے میں لگی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر عید کی خوشی تو تھی ہی مگر کسی کے آنے کا انتظار بھی واضح تھا۔

''تو کہاں تھا صبح سے؟ دیکھو ذرا صبح سے نکلا اب آیا ہے۔''

''کیا ہوا اماں حضور، کیا آفت آ گئی۔''

''تجھے میں نے کہا بھی تھا کہ اسٹیشن سے جا کے اپنے ماموں اور ممانی کو لے آتا۔۔۔۔۔ بھائی جان خیریت سے آ جائیں، اللہ جانے ان کو گھر کا راستہ یاد رہا ہوگا کہ نہیں۔'' گھر کے دروازے پر ایک دستک ہوئی اور ایک چالیس سالہ آدمی، ایک خاتون اور ایک بیس سالہ نوجوان لڑکے کے ساتھ گھر کے دروازے سے داخل ہوا اور بولا ''میں نے ملک ضرور بدلا ہے مگر یادداشت نہیں بدلی، مجھے سب راستے ابھی بھی اچھی طرح یاد ہیں۔'' سلطانہ بیگم تو جیسے ان کے پیروں تلے زمین نکل گئی ہو۔ اس کا جسم کانپنے لگا، اور خوشی کے آنسو آنکھوں سے چھلک کر چہرے سے نیچے گرنا شروع ہو گئے۔ سلطانہ بیگم کا پاکستان سے آیا ہوا بھائی آگے بڑھا اور اپنی بہن سلطانہ کو گلے لگا لیا۔ دونوں کی چند لمحوں کی

ملاقات ایسے تھی جیسے کئی سالوں کی یادیں اور باتیں، ان لمحوں میں ایک دوسرے سے بیان کردی ہوں۔ چندا یہ منظر گھر کی پہلی منزل سے دیکھ رہی تھی اور اس کے اندر بھی جذبات جاگے اور وہ رو پڑی۔

اسی وقت چندا کی نظر ماموں کے بیٹے آصف پڑی جو آج سے دس سال پہلے بٹوارے کے وقت ماموں اور ممانی کے ساتھ پاکستان چلا گیا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے کی شکلیں کچھ زیادہ یاد نہیں رہی تھیں، تب دونوں کافی چھوٹے تھے۔ مگر آج جیسے ہی ایک دوسرے کو دیکھا تو ایسا لگا جیسے کہ پرانی یادیں واپس آ گئی ہوں۔ چندا کے ذہن میں پھرتا یہ خیال کچھ دھندلانے لگا، جب اچانک اس کے کانوں میں کچن سے شیشے کے گلاس کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس کا یہ خیال اس کے ذہن سے ہزاروں میل دور کھو گیا۔

آج سے بیس سال پرانا یہ واقعہ اس کو اکثر اس کے گھر کی رونقیں اور آصف سے پہلی ملاقات کی یاد دلا دیتا۔ اسی ملاقات میں دونوں کے رشتے کی بات بھی شروع ہوئی تھی جس کا اختتام ان کی شادی پر ہوا۔ شادی کے بعد چندا اپنے شوہر آصف کے ساتھ پاکستان کے شہر حیدرآباد چلی گئی تھی۔ آج کل پرانی یادیں کچھ زیادہ ہی ستانے لگی تھیں۔ بانجھ پن کی وجہ سے اس کا کوئی بچہ بھی نہیں ہوا تھا۔

ماں چندا سے کہتی، ''تیرے چلے جانے کے بعد میرا کیا ہوگا؟''

''اماں دیکھنا شادی کے بعد میں تمھیں ہر مہینے ملنے آیا کروں گی۔''

''چل پگلی، اس ملک سے اس ملک کا آنا جانا اتنا بھی آسان نہیں ہے۔''

''مجھے تو پاکستان پہلے ہی بہت پسند تھا، اور اب تو میں وہاں جارہی ہوں۔''

''بس میری دعا ہے کہ جو بھی ہو سب خیریت سے ہو۔''

شادی کے پانچ ماہ بعد چندا نے اپنی ماں کو خط لکھا کہ اگلے مہینے وہ ماں سے ملنے ضرور آئے گی اور آکر اپنے دل کی باتیں بتائے گی۔ ماں کے اندر بیٹی کے آنے کا انتظار شروع ہوگیا۔ چندا نے اپنے شوہر آصف کے ساتھ کراچی میں انڈین ہائی کمیشن سے ویزے کے سلسلے میں اپنا پاکستانی پاسپورٹ جمع کروایا۔ دو ہفتوں بعد جب وہ اپنا ویزا اور پاسپورٹ لینے گئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا پاسپورٹ کہیں گم ہو گیا ہے اور جب تک پاسپورٹ نہیں ملے گا اسے

بھارت جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ وہ بہت حیران ہوئی، افسروں سے ملی اور انھیں بتایا ہے کہ وہ وہیں سے آئی ہے، پھر یہ سختیاں کیوں۔ اسے سمجھایا گیا کہ شادی کے بعد وہ ہندوستانی نہیں رہی بلکہ ایک پاکستانی بن چکی ہے۔ اس وقت اسے اندازہ ہوا کہ اس کی شادی سے نہ صرف اس کا گھر بدلا ہے، بلکہ اس کی اپنی شناخت بھی بدل گئی ہے۔ یہ چیز اسے عجیب کش مکش میں ڈال گئی۔ اس نے ماں کو اس واقعے کی خبر کر دی جس کے بعد ماں بہت افسردہ ہوئی۔ ماں نے خدا سے دعا کی کہ کسی طریقے سے پاسپورٹ مل جائے اور وہ اپنی بیٹی سے مل سکے۔

چند مہینے گزرے مگر پاسپورٹ کا کوئی پتا نہیں چلا۔ ماں سے انتظار نہیں ہو رہا تھا۔ ماں نے اپنے بیٹے کے ساتھ پاکستان کے ویزے کے لیے درخواست دی مگر انھی دنوں ۱۹۶۵ء کی جنگ کا آغاز ہو گیا اور کسی کا بھی بھارت سے پاکستان جانا یا پاکستان سے بھارت آنا مشکل ہو گیا۔

''اماں! پاکستان کے لوگ کیسے ہوں گے؟ کیا وہ ہماری طرح ہوں گے؟''

''تو اور کیا وہ کون سا کوئی خدا کی انوکھی مخلوق ہے، وہ بھی انسان ہیں۔''

حیدرآباد میں جس محلے میں آصف اپنی بیوی چندا کے ساتھ رہائش پذیر ہوا تھا، وہاں پہ چندا کو چندا کم اور ہندوستانی کے نام سے زیادہ جانا جاتا تھا۔ چندا اکثر یہ نام سن کر خوش ہوتی تھی۔ مگر اسے جب سے یہ معلوم ہوا کہ اب وہ ہندوستانی نہیں پاکستانی بن گئی ہے۔ اس کے اندر ہندوستانی کا نام سنتے ہی ایک خوف دوڑتا جو اس کے ہونے پر سوال اٹھاتا۔

چندا کا اپنی ماں سے خطوط کے ذریعے رابطہ مسلسل رہا۔ دونوں ایک دوسرے کے خط پا کر لمحے بھر کے لیے ایک دوسرے کو قریب محسوس کرتیں۔ وقت گزرتا گیا، یادیں اور گہری ہوتی گئی۔ پاسپورٹ کو گم ہوئے بیس سال گزر چکے تھے۔ اسی دوران ایک حادثے میں چندا کا خاوند آصف بھی مر گیا، اس کے ماموں اور ممانی بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کے اندر اور باہر کی دنیا اب عجیب ہو چکی تھی۔ وہ اب ان دیکھی ہتھکڑیوں میں جکڑی تھی۔

ایک روز اچانک چندا کو خبر ملی کہ اسے انڈین ہائی کمیشن میں بلوایا گیا ہے، جو کراچی سے اسلام آباد منتقل ہو چکا تھا۔ بے چاری کسی طریقے سے اسلام آباد پہنچی۔ وہاں معلوم ہوا کہ اس کا پاسپورٹ مل چکا ہے اور اس کا ویزا بھی لگ چکا ہے۔ اس بات کو سنتے ہی جیسے اس کی ساری ٹوٹی ہوئی دنیا، برباد ہوئے لمحے ایک ہی پل میں اس کے پاس آ

گئے ہوں، اس کی تمام نا امیدیاں امید سے بھی آگے جا چکی ہوں۔

ویزا اور پاسپورٹ پکڑا اور بھارت جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اسی دوران چندا کو بھارت سے ایک خط ملا جس میں اسے آگاہ کیا گیا کہ اس کی ماں کی طبیعت زیادہ بہتر نہیں ہے۔ چندا کی بھارت جانے کی بے چینی اب اور زیادہ بڑھ گئی۔ ویزے پہ جس جگہ سے بھارت جانے کا لکھا تھا، چندا اس جگہ پہنچ گئی۔ وہاں پہنچ کر اسے بتایا کہ حالات خراب ہونے کی وجہ سے بارڈر سے آمدورفت مکمل بند ہے۔ چندا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، واہگہ بارڈر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اسے امید تھی کہ وہ وہاں سے آسانی سے بھارت چلی جائے گی۔ وہاں پہنچی تو اسے روک لیا گیا اور کہا گیا کہ یہاں سے گزرنے کے لیے اسے انڈین ہائی کمیشن کی اجازت لینا ہوگی چوں کہ اس کے ویزے پر دوسری جگہ سے جانے کا لکھا ہے اس لیے وہ اسے یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس کا ان حالات میں اسلام آباد جانا دشوار تھا۔ مگر وہ ہمت کر کے گئی اور وہاں جا کر ارجنٹ درخواست جمع کروا دی۔ جس پر خدا کی مہربانی سے جلدی عمل ہو گیا۔ اسے کراچی سے ممبئی ہوائی جہاز کے ذریعے سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

وہ فلائٹ سے ایک دن پہلے اپنے گھر حیدرآباد گئی جہاں اسے ایک خط ملا جس میں اس کی ماں کی موت کا ذکر تھا۔ اس کی ماں کی چار روز پہلے وفات ہو چکی تھی۔ اسے چکر آنے لگے اور وہ وہیں پر بے ہوش ہو گئی۔ تین ہفتے بعد وہ آخر کار بھارت اپنے گھر پہنچ گئی اور سیدھی اپنی ماں کی قبر پر جا پہنچی۔ وہاں جا کر اپنی ماں کو اپنے سفر کی تمام کہانیاں، قصے سنانے لگی۔ چند لمحوں کو اس نے صدیوں میں بدل دیا اور تمام باتیں کہہ ڈالیں۔ چند روز بعد پولیس اسٹیشن میں چندا کی موت کا سرٹیفکیٹ پہنچا۔ جس کے بعد اسے ایسی آزادی نصیب ہوئی جس کی کوئی حد اور کوئی شناخت نہیں تھی۔

حجاب فاطمہ

کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

بھوک

''جنوبی کوریا کے شہر سیول میں پھر سے بارش کے امکانات''......اونہہ، اوپر والوں نے بھی ابھی ہی بند کرنی تھی آواز۔

''علی بیٹا، فون پر دیکھو، کچھ بارش کے بارے میں۔''

''بابا فون پر، اس فون پر تو کچھ نہیں چلتا۔ لیکن بابا ادھر تو موسم صحیح لگ رہا ہے ابھی۔''

'تمھارا دوست احسن، اچھی پڑھائی کر رہا ہے اور پیسے بھی کما رہا ہے۔ تم خود بھی کچھ کر لو۔ اُس سے ہی سیکھ لو، یہ کھڑکی کے باہر احسن آیا ہے؟'

''ہیلو اکبر انکل۔ میں بس علی سے ملنے آیا تھا کچھ بات کرنی ہے۔''

''ہاں ہاں۔ بیٹا علی، باہر لے جا کر ہی بات ہو گی، ادھر تو جگہ بھی نہیں بیٹھنے کی۔''

''جی بابا۔''

کیا ہوا احسن، آج خیریت سے؟

ارے علی اچھی خبر لایا ہوں تمھارے لیے، میرا باہر امریکا میں کالج میں داخلہ ہو گیا ہے اور میں جس امیر لڑکی کو پڑھاتا تھا اسے اب تم پڑھاؤ گے۔ دیکھو علی تم نے ادھر کالج کے لیے بہت بار امتحانات دیے ہوئے ہیں، تم سے بہتر انگریزی کوئی بھی اس کو نہیں پڑھا سکتا۔

لیکن احسن میرا ابھی کسی کالج میں داخلہ نہیں ہوا اور مالی حالات کی وجہ سے ڈگری بھی کوئی نہیں ہے میرے پاس۔ میں بہت غریب ماں باپ کا بچہ ہوں، ان امیروں کے گھر بنا ڈگری کے جا کر جیل نہیں جانا۔

علی پیسے جتنے مانگو کے اتنے ملیں گے۔ جہاں تک ڈگری کی بات ہے تو تمھاری بہن آمنہ ہے وہ تمھارے مطابق اکثر جعلی کاغذات بناتی ہے، اس سے اپنی ڈگری بھی بنوالو اور میری جگہ اس بچی کو پڑھانے کے لیے جاؤ۔

''آمنہ یہ تو کہیں سے بھی جعلی نہیں لگ رہی، یار تم تو ماہر ہو۔''

اچھا بس، علی اُدھر جا کر واپسی کے لیے کچھ پیسے مانگ لینا، گھر میں راشن ختم ہو گیا ہے، کچھ ڈھونڈ لینا پلیز۔

''جی میں احسن کی جگہ آپ کی بیٹی ایمان کو انگریزی کی کلاس دینے آیا ہوں۔''

''جی جی آپ اندر آجائیں۔''

احسن نے درست کہا تھا، ان کا باغیچہ ہمارے گھر سے بھی بڑا ہے۔

''جی آپ اس طرف آجائیں۔ میڈم ابھی آتی ہیں۔''

''جی شکریہ۔''

''مجھے احسن نے آپ کے بارے میں بتایا تھا لیکن میرے لیے آپ کی ڈگری سے زیادہ آپ کے پڑھانے کا طریقہ اہم ہے۔ آپ جتنی رقم مانگیں گے، آپ کو اتنی رقم دی جائے گی لیکن پڑھائی میں کوئی کمی نہیں آنی چاہیے۔''

''جی میڈم۔''

''یہ تصویر آپ کے بیٹے نے بنائی ہے میڈم؟''

''جی! بس آج کل میں اس کے لیے آرٹس ٹیچر کی تلاش میں ہوں۔ خیر آپ کل سے آسکتے ہیں۔ احسن نے بالکل صحیح استاد بھیجا ہے۔''

''جی شکریہ اور اگر آپ بُرا نہ مانیں تو کیا ایک مشورہ دے سکتا ہوں؟''

''جی جی علی صاحب، آپ دیں مشورہ۔''

''میری نظر میں آپ کے بیٹے کے لیے ایک آرٹس ٹیچر ہیں وہ امریکا سے اپنی ڈگری پوری کر کے آئی ہیں

لیکن ان کی بہت مانگ ہے آج کل۔ اگر آپ چاہیں تو میں ان سے بات کر سکتا ہوں۔''

''جی مسٹر علی، بہت شکریہ آپ کا، پلیز کوشش کیجیے۔''

''آمنہ بس یاد رکھنا، تم امریکا سے آئی ہو اور تم میری دوست جنت کی دوست ہو اور آرٹس کے بارے میں تو تم نے سب کچھ دیکھ ہی لیا تھا؟''

''ہاں ہاں دیکھ لیا تھا، آپ گھنٹی بجا دو۔''

''آہستہ آمنہ اور تمھارا نام جسیکا (Jessica) ہے، یاد رکھنا۔''

''میڈم ہیلو، یہ وہ مس جسیکا جن کا ذکر کیا تھا آپ کے ساتھ۔''

''کیا آپ کے بیٹے کو میں آپ کی غیر موجودگی میں پڑھا سکتی ہوں، کیوں کہ یہ میرا اصول ہے۔''

''ماما مجھے انھی سے پڑھنا ہے۔''

''اچھا احمد بیٹا، آپ اندر جاؤ۔''

''دیکھیں آپ کے بیٹے کو ہر روز چار گھنٹے دینا ضروری ہے اور میری مانگ بھی بہت زیادہ......''

آپ جتنی رقم مانگیں گی اس سے زیادہ دے دی جائے گی آپ کو'

''ہیلو! یہ کون ہیں؟ ایمان؟''

اوہ آپ آ گئے، یہ ہمارے بیٹے کی آرٹس ٹیچر ہیں۔

''آپ اس وقت اکیلے نہ جائیں، ہمارا ڈرائیور آپ کو چھوڑ آتا ہے۔''

''جی ٹھیک ہے، شکریہ سر عثمان۔''

''بابا بھی گاڑی چلاتے تھے، ڈرائیور ہی تو تھے پہلے تو اب کیوں نہیں'

''ایمان میڈم، آپ کے ڈرائیور نے میرے ساتھ کل بہت بدتمیزی کی ہے اور میں ایسی جگہ .....''

''نہیں نہیں، آپ کہیں نہیں جائیں۔ میں معذرت خواہ ہوں مس جسیکا ہم اسے نوکری سے نکال دیں گے۔''

''میڈم میں اب چلتی ہوں۔''

''آپ ٹھیک ہیں؟ اب ڈرائیور کو نکال دیا ہے تو گھر کے لیے سامان لینے جانا تھا۔''

''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کے لیے بہترین ڈرائیور لا کے دے سکتی ہوں۔ میرے انکل کے پاس کام کرتے ہوتے تھے۔ کافی تعریف سنی ہوئی ہے میں نے ان کی۔ اگر آپ.....''

''جی پلیز، بہت چیزیں لانے والی ہیں۔''

''آپ واقعی میں گاڑی بہت اچھی چلاتے ہیں۔ آپ نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟''

''جی سر، اکبر نام ہے میرا، سر''

''میری بیوی نے اگر تمھیں نوکری پر رکھا ہے تو ضرور کام کے آدمی ہو گے، ہمیشہ لائن کراس (Line Cross) نہیں کرنی، یعنی اپنی حدود میں رہیے گا اور مجھے یہ عادت بہت بُری لگتی ہے جب کوئی 'کام والا' میرے ساتھ زیادہ باتیں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بس ہمیشہ اپنی حدود میں رہیے گا اور آپ اس نوکری پر رہیں گے۔'

''جی سر عثمان''

''اکبر، کیا بتاؤں۔ دونوں بچے پڑھائی سے خوش ہیں لیکن پچھلے دو دنوں سے ہماری کام والی کی طبیعت نہیں ٹھیک اور میں بہت پریشان ہوں اپنے بچوں کے لیے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا، کوئی کیسے کہاں سے لاؤں؟''

''میڈم میں ایک عورت کو جانتا ہوں، جو بڑے گھروں میں کام کرنے کی عادی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں......''

''ہاں پلیز کچھ کریں، کیوں کہ مجھ سے تو کچھ نہیں سنبھالا جا رہا اور گھر کا حال برا ہو ہی رہا ہے اور اس کی طبیعت بہت خراب ہے، بہتر شاید نہیں ہوگی کچھ عرصے تک تو۔''

''جی میڈم''

''میری پیاری بیوی، میں نے تمھارے لیے بھی بندوبست کر لیا ہے۔ اُس گھر سے اب ایک ہی گھر کے سارے افراد پیسے کمائیں گے۔''

''اکبر میں کوشش کروں گی کہ ہم سب انجانوں کی طرح کام کرسکیں لیکن وہ خاتون جس کو علی اور آمنہ نے پیار کیا ہے اگر وہ واپس آ گئی تو کیا کریں گے؟''

''جب ویسا ہو گا تو دیکھا جائے گا میری پیاری بیوی، ابھی پیٹ بھر کے کھانا کھا لو۔ ہفتوں بعد کچھ اچھا کھانے کو مل رہا ہے۔ یقین کرلو عائشہ، ہم بھی اب تازہ کھانا کھایا کریں گے۔''

''عائشہ نام ہے آپ کا؟''

''جی۔''

''آپ کا کام پسند آیا ہے مجھے، آپ آج سے ہی کام شروع کر دیں اور ہاں، کل سے نہا کر آیئے گا۔ مجھے یہ بو نہیں آنی چاہیے جیسے کسی چھوٹے جھونپڑے سے آتی ہے۔ میں برداشت کرلوں گی لیکن عثمان کو بو پسند نہیں۔''

''جی میڈم''

''ہم رات کو آج باہر جا رہے ہیں۔ اور گھر پر کوئی نہیں ہو گا تو اپنی حدود میں رہتے ہوئے کام کرنا۔''

''جی صاحب جی۔''

''چلو شکر ہے سب چلے گئے۔ اب ہم چار دن سکون سے بیٹھ تو سکتے ہیں، اور کیا چاہیے۔''

''اوہ بجلی، چلو بارش بھی آ گئی، اب تو ہم.......''

''اونہہ اس وقت دروازے پر کون ہوسکتا ہے؟ یہ تو، یہ تو پرانے کام والے لوگ ہیں، ڈرائیور اور وہ۔''

''جی کیا کام ہے آپ کو؟''

''ہم کچھ سامان جلدی میں لے کر جانا بھول گئے تھے، ہم بس وہ لینے آئے ہیں۔ کافی تیز بارش ہو رہی ہے، ہم پر رحم کرو۔''

''ٹھیک ہے، اندر آ جاؤ......''

''ارے یہ کیا، ارے بچاؤ! علی بیٹا، عائشہ، اٹھو!، اکبر! یہ آپ نے؟ کہیں مر تو نہیں گئے دونوں؟''

''نہیں! کیسی باتیں کر رہی ہو، بے ہوش ہوئے ہیں۔ عورت زیادہ زخمی ہو گئی ہے۔''

''اکبر، ان کے باورچی خانے سے ایک راستہ تہہ خانے کی طرف بھی جاتا ہے۔ وہاں چھوڑ آتے ہیں ان دونوں کو، ٹھیک ہے؟''

''ہاں۔''

''اس وقت کون فون کرر ہا ہے؟''

''میڈم اور سب دس منٹ میں واپس آ رہے ہیں۔ جلدی سے مجھے بتاؤ یہ ڈش کیسے بناتے ہیں اور جلدی نکلو ایک ساتھ دیکھ لیا تو مشکل ہو جائے گی۔''

''ہاں ہاں جا رہے ہیں عائشہ۔''

''میڈم آپ جلدی واپس آ گئیں؟''

''ہاں وہ بارش شروع ہو گئی تھی تو سوچا کہ گھر میں ہی اس رحمت کا مزہ لیں۔''

''ارے ہمارا سامان! ارے یہ کیا ہو گیا! کھڑکی بند کرو، سارا بارش کا پانی اندر آ رہا ہے۔ یہ سب کیسے نکالیں گے اب ہم!''

''علی بیٹا! ابھی کے لیے ایک دو جو کپڑے ہیں وہ پکڑ لو ہر طرف گٹر کا پانی آ گیا ہوا ہے۔ آج شاید باہر ٹھنڈ میں سونا پڑے۔''

''اکبر اچھا کیا آج جلدی آ گئے تم ،کل کی رحمت والی بارش نے تو آج موسم ہی زبردست کر دیا ہے۔''

''واقعی! بارش بڑی رحمت ہے، کیوں سہی کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی صاحب جی۔''

تم سے آج بھی بد بو آ رہی ہے، ویسے تھوڑا خیال ہی کر لو میرا۔ خیر آج سال گرہ منا رہے ہیں احمد کی، تم بھی ساتھ ہو گے مزہ آئے گا تمھیں۔

''اماں کیا تہہ خانے میں چکر لگا یا تھا، ان دونوں کو دیکھنے کے لیے؟''

''نہیں! تم جا کر دیکھو کہیں مر نہ جائیں۔''

''ٹھیک کہا ہے، میں آتی ہوں دیکھ کر۔''

''ارے مس جسیکا، آپ یہاں ہیں، میں آپ کو کب سے ڈھونڈ رہی ہوں۔''

''اگر آپ یہ کیک لے جائیں گی گراؤنڈ میں، اگر آپ نے احمد کے پاس لے کر جانا ہے تو وہ بہت خوش ہو جائے گا آپ کو دیکھ کر۔''

''جی شاید۔ ارے تم کون ہو؟ مس جسیکا!!! نہیں میری بیٹی نہیں! میرے بیٹے کو نہیں! علی! احمد!! احمد بے ہوش ہوگیا ہے اُسے ہسپتال لے کر جانا ہے۔ ڈرائیور کیا کر رہے ہو؟ چلو!''

''گاڑی کی چابی دو! ابھی۔''

''لیکن میری بیٹی، غریب کی بیٹی؟''

''گاڑی کی چابی! ابھی! جلدی!''

''لیکن ان کا بچہ صرف بے ہوش، اور میرے دونوں خون میں نہلائے ہوئے۔''

''اکبر چابی دو! ابھی۔''

''یہ اس قاتل کے پاس کیوں پھینک دی ہے تم نے، چھی، اتنی بدبو، مل گئی چابی، چلو جلدی۔''

''بارش رحمت تھی، میری بیٹی سب کے سامنے مرگئی۔''

''اس قاتل سے میرے جیسی بو آرہی تھی؟''

''نہیں۔''

''آج کی تازہ خبر، جہاں بارش زیادہ ہونے کی وجہ سے تباہ ہونے والے گھروں کی تعداد بڑھی ہے وہاں ایک اور سنسنی خیز خبر۔ ایک نام ور ہستی مسٹر عثمان کا قتل جو انھی کے گھر میں انھی کے ڈرائیور کے ہاتھوں ہوا۔ ساتھ دو نامعلوم افراد کا قتل بھی ہوا۔ لیکن مسٹر عثمان نہ صرف ایک محنتی انسان تھے بلکہ خیال رکھنے والے انسان بھی تھے۔''

''کیا پیسے کی بھوک وجہ بنی یا اپنی شناخت اس ڈرائیور کے لیے، یا صرف جلن۔''

''مسٹر عثمان کے علاوہ......''

''ان دو افراد کا قتل اور شناخت اتنی ضروری نہیں صرف اس کی بات کرو جس سے ریٹنگ بڑھے۔''

''ہیڈ لائنز میں مسٹر عثمان کے قتل کی مذمت اور باقی خبریں بریک کے بعد!''

حسان شعوانہ
کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

رزق

سورج سوا نیزے پر چمک رہا تھا۔ گلی میں دو بچے اچھلتے ہوئے سکول سے گھر کی طرف گامزن تھے۔ ''بھیا! آپ نے آج پھر لنچ میں سے پراٹھا بچا لیا؟'' آٹھ سالہ عمیر نے اپنے بڑے بھائی کے ہاتھ میں لنچ باکس دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں عمر، کیوں آج پرندوں کے کھانے کی چھٹی ہے کیا؟'' بارہ سال صائم نے ہلکا سا مسکرا کر کہا۔

''تمھیں معلوم ہے نا، ابو کہتے ہیں کہ ہمیں رزق اللہ پہنچاتا اور اس کے لیے وسائل پیدا کرتا ہے، جیسے ابو کی نوکری۔ اور جانوروں کو بھی رزق اللہ دیتا ہے اور اگر ہم اس کا ذریعہ بن جائیں تو اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتے ہیں۔'' اس نے رسان سے باپ سے سیکھا ہوا سبق چھوٹے بھائی کو دیا۔

آخری بات نے عمر کو پُر جوش کر دیا، اس نے چمکتی آنکھوں سے پوچھا ''جب اللہ میاں ہم سے خوش ہو جائیں گے تو ہمیں زیادہ رزق دیں گے؟''

صائم ایک لمحے کے خاموش ہو گیا، پھر بولا ''عمر! رزق زیادہ یا کم نہیں تو، رزق حلال یا حرام ہوتا ہے اور ہم حلال رزق کھاتے ہیں۔ ابو نے سمجھایا تھا۔''

عمر نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا اور صائم نے لنچ باکس کھول کر پراٹھے کے ٹکڑے کرنے شروع کیے۔ وہ گلی کے اس کونے تک آ گئے تھے جہاں پر بلیوں کا رش رہتا تھا۔ رات کو کتے بھی کھانے کی اشیا کی بو سونگھ کر آ جاتے تھے اور لوگوں کے پہنچائے ہوئے رزق سے سیر ہوتے تھے۔

وہ دونوں بھائی گھر پہنچ کر کچن کی طرف دوڑے کیوں کہ آج بدھ تھا اور بدھ کو امی چاول بناتی تھیں۔لیکن آج امّی اور چاول، دونوں کو کچن میں نہ پا کر وہ گھبرا گئے۔امّی دروازہ کھلا چھوڑ کر کہاں جاسکتی تھیں۔ایک کمرے، کچن اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل گھر میں دو منٹ میں وہ ڈھونڈ چکے تھے لیکن امّی کہیں نظر نہ آئیں۔دو گھنٹے کے کڑے انتظار کے بعد امّی اور ابو گھر آئے تو معلوم ہوا کہ امّی کی طبیعت کی خرابی کے باعث انھیں ہسپتال جانا پڑا تھا۔جمیل نے بچوں کو نہلا کر کل کا بچا کھچا کھانا کھلایا اور سکول کا کام کرنے کو کہا اور خود ثمینہ کی فائل کھول کر بیٹھ گیا۔ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آپریشن جلد از جلد کروانا چاہیے ورنہ جان کو خطرہ تھا۔وہ آرام کرتی اپنی شریک حیات کو دیکھنے لگا جس نے اتنے برس اس کے ساتھ تنگی حالات میں ہنسی خوشی گزارا کیا تھا اور وہ اس قابل بھی نہ تھا کہ اس کے لیے علاج کی سہولت فراہم کر سکتا۔

رات کو سونے سے پہلے بے چین صائم، جمیل کے پاس آکر پوچھنے لگا۔

''ابو!امّی کو کیا ہوا ہے؟ وہ تب سے سو رہی ہیں۔''

جمیل نے اپنی ٹوٹتی ہوئی ہمت کو بحال کر کے بیٹے کو سمجھایا! ''ہاں بیٹا، ان کی دوا میں نیند تھی اس لیے وہ سو رہی ہیں۔ان کے گردے میں پتھری ہوگئی ہے جس کی وجہ سے آج تکلیف زیادہ ہوگئی تو ہسپتال جانا پڑا۔''اس نے صائم کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بتایا۔

صائم نے نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلایا اور دل میں اللہ تعالیٰ سے سب ٹھیک ہو جانے کی دعائیں کرنے لگا کیوں کہ ابو کی باتوں سے اتنا سمجھ آ گیا تھا کہ بات کوئی پریشانی کی ہی تھی۔

اگلی صبح جمیل اپنے آفس کے ایچ آر منیجر کے دفتر میں کھڑا ان سے اپنی درخواست قبول کرنے کے لیے التجا کر رہا تھا۔''سر یہ تو میری پچھلے دو سال کی وہ تنخواہ ہے جو ہم سب چپراسیوں کو نہیں دی گئی تھی۔یہ تو ہمارا حق ہے اور اب مجھے اس کی بہت ضرورت ہے۔'' اس نے ایک بار پھر کوشش کی تو زعیم صاحب کو تاؤ آ گیا۔

''جمیل تمھیں بات سمجھ کیوں نہیں آ رہی۔کمپنی کو آج کل اس سے بڑے بڑے مسائل درپیش ہیں۔رُکی ہوئی تنخواہیں سال کے آخری مہینے سے پہلے پراسس نہیں ہوسکتیں۔تم اپنی بیوی کے علاج کے لیے کسی قرضے کا انتظام

کرلو۔'' یہ کہہ کر وہ کمپیوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مطلب جمیل کی مزید کوئی بات سننا اب گوارا نہ تھا۔ جمیل سر جھکائے کمرے سے نکل آیا اور اشک بار آنکھوں سے اللہ کے حضور دعا گو ہو گیا۔

اُسی شام زعیم صاحب اپنے گھر کے کشادہ لان میں چائے پی رہے تھے تو ان کی بڑی بیٹی نور آ گئی۔

''بابا! میں کب سے ڈھونڈ رہی تھی۔'' اس نے چلا کر لاڈ سے کہا تو زعیم صاحب مسکرا کر پوچھنے لگے۔

''کیوں بھئی! کیا ہوا جو ہماری مصروف بیٹی کو ہماری یاد آ گئی۔''

''بابا! آپ کو پتا ہے میرے کالج میں کل ایک چیریٹی شو ہے اور میں کوئی بڑی چیز ڈونیٹ کرنا چاہتی ہوں لیکن مما نے کہا ہے کہ پانچ ہزار سے زیادہ کچھ نہیں دینا۔'' اس نے اپنا مسئلہ بتایا تو وہ ہنسے۔

''ہاں تو ٹھیک ہی تو کہا ہے۔ ہم کون سا کوئی مل اونر ہیں جو لاکھوں روپے خیرات میں نکال دیں۔''

نور کو بابا کی بات سن کر دکھ ہوا اُسے والدین کی طرف سے مایوسی ہوئی تو وہ ایک مشکل فیصلے تک پہنچ گئی۔ اس کے پاس کئی ایسی قیمتی اشیاء تھیں جو اس نے مہینوں، سالوں سے استعمال نہیں کی تھیں۔ اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے زعیم صاحب اور ان کی بیگم اُس پر بے جا خرچ کرتے تھے۔ اس نے ان تمام چیزوں میں سے اپنا سونے کا لاکٹ عطیہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اتنا دے سکے جس سے کم از کم کسی ایک گھرانے کی ہی مدد ہو سکے۔ اس کے کالج کی این جی او اس بار ایک پسماندہ علاقے کے گھروں کی مدد کرنے کے لیے فنڈز اکٹھے کر رہی تھی اور اس نے اپنا حصہ ڈالنے کا عہد کرلیا تھا۔

ثمینہ کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی اور صائم کی دعاؤں کی شدت بھی۔ کافی روز گزر جانے کے بعد بھی رقم کا انتظام نہ ہو سکا تھا اور زندگی میں پہلی مرتبہ جمیل کا یقین اور اُمید کمزور پڑ رہی تھی۔ وہ مغرب کی نماز کے بعد جائے نماز پر بیٹھا اللہ سے گلوں شکوؤں میں مصروف تھا جب دروازہ بجا۔ دروازہ کھولا تو اس کا چچا زاد سلیم، جو پچھلی گلی کا ہی رہائشی تھا، وہ چہرے پر بے تحاشا خوشی لیے کھڑا تھا۔

''ارے جمیل! تمھاری دعائیں اللہ نے سن لیں۔ تمھارا رزق دینے آیا ہوں جو اللہ نے بھیجا ہے، ثمینہ بھابی کے علاج کے لیے۔''

جمیل نہ سمجھی سے اسے تکتا رہا تو وہ تفصیل بتانے لگا۔

''یار، میری بیوی سڑک والے کالج میں صفائی کا کام کرتی ہے نا، تو وہاں کل کوئی پروگرام تھا جس میں بچے پیسے جمع کر کے غریبوں میں بانٹتے ہیں تو ایک بچی نے تحفے کی غرض سے ایک سونے کا لاکٹ اسے دیا ہے۔ میں نے معلوم کرایا ہے، اس کی قیمت کوئی چالیس ہزار تک ہے۔ میں نے تمھارا بیس ہزار کا قرض واپس کرنا ہے جو تین سال پہلے لیا۔ تمھارے اچھے اور میرے برے حالات کے دنوں میں بس وہی چکا دوں گا۔ تمھیں اگر مزید روپے کی ضرورت ہو تو وہ بھی مجھ سے لے لینا پھر بعد میں کبھی......''

سلیم بولے جا رہا تھا اور جمیل کو اب سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے بس ہر طرف اللہ کی رحمت نظر آ رہی تھی اور کانوں میں صائم کی آواز سنائی دے رہی تھی جس نے کل اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''ابو! اللہ اگر ہمارے ذریعے جانوروں کو رزق پہنچا سکتا ہے تو وہ کسی بھی ذریعے سے ہمیں بھی رزق پہنچا دے گا، مجھے پتا ہے۔ آپ بس پریشان نہ ہوں۔''

اللہ کا رزق کا وعدہ پورا ہو چکا تھا۔

وسیم عباس

کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

سنیپ سٹریک

''اوہ شِٹ''

بائیولوجی لیب میں کام کرتے ہوئے اچانک اس کی دوست نے افسردگی سے کہا۔

اس کا ردِعمل دیکھتے ہی وہ چونک گیا، اسے لگا شاید اس کی دوست نے تجربہ کرنے میں کوئی غلطی کردی ہے۔

''کیا ہوا، تم ٹھیک تو ہو؟؟؟''

''یار سارہ نے سٹریک توڑ دی ہے۔'' اس کی آواز میں تلخی تھی۔ مجھے شدید غصّہ آرہا ہے اس پہ، وہ ہمیشہ ایسے کرتی ہے۔

عبدالہادی نے اس کے لہجے کی کڑواہٹ دیکھتے ہوئے اس کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

''چلو کوئی بات نہیں ایک سنیپ چیٹ سٹریک ہی تو تھی۔ تم دوبارہ سٹارٹ کر دینا۔''

''ہادی!! تمھیں پتا نہیں ہے کتنا دکھ ہوتا ہے جب کسی سے سٹریک ٹوٹ جاتی ہے۔ تم سنیپ چیٹ استعمال نہیں کرتے لہٰذا میرا دُکھ نہیں سمجھ سکتے۔''

ہادی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ''صحیح کہتی ہو تم''

''بلکہ مجھے تو ان سٹریکس کے بارے میں بھی علی نے بتایا تھا، ورنہ اس سے پہلے میں ان سے بھی بے خبر تھا'' اس نے بات کو جاری رکھا۔

اسی لیے تم سٹریک ٹوٹنے کا درد نہیں سمجھو گے۔ اس کی دوست نے تجربہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

شام ہو چکی تھی اور تقریباً تمام کلاسز اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھیں، شاید اسی لیے اس وقت یونیورسٹی میں لوگوں کی چہل پہل قدرے زیادہ تھی۔ اس کے ساتھ معمول سے زیادہ بڑھتی ہوئی سردی اور ٹھنڈی ہوا نے لوگوں میں ایک پھرتی پیدا کر دی تھی۔ ہر شخص ایک تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔

عبدالہادی نے پارکنگ سے اپنی بائیک نکالی اور گھر کا رخ کیا۔ اس کا گھر یونیورسٹی سے کوئی تیس منٹ کی مسافت پر تھا۔ جب وہ گھر پہنچا تو دن ڈھل چکا تھا۔ اس کے برف سے جمے سرخ ہاتھ اور ناک سردی کی سختی کے خبر دے رہے تھے۔ دن بھر کی تھکن کے باعث وہ گھر آتے ہی سو گیا۔

''حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ''

''حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ''

کمرے کے کھڑکی سے اذان کے الفاظ اس کے کانوں میں پڑ رہے تھے۔

عبدالہادی نیم بے داری میں اپنے بستر پر پڑا ان الفاظ پر غور کرنے لگا۔ بہ ظاہر اس سے پہلے اس نے اتنی توجہ اذان کے معنی پر نہیں دی تھی لیکن نہ جانے کیوں آج اس کے ذہن میں یہ بات آئی اور وہ کافی دیر اسی سوچ کے ساتھ بستر پر لیٹا رہا۔

وہ عشا کی نماز کی ادا کر کے اپنے کمرے کی بالکنی میں کھڑا سڑک پر تیزی سے گزرتی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ یخ بستہ ہوا اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر رہی تھی۔

''کتنا دکھ ہوتا ہے جب کسی سے سٹریک ٹوٹ جاتی ہے''۔ اس کی دوست کے الفاظ اس کی سوچوں کے سمندر میں ٹھاٹھیں مارنے لگے۔

''سنیپ چیٹ سٹریک'' کتنی اہم ہو چکی ہے لوگوں کے لیے؟؟ اسے اپنی دوست کے ایکس پریشن یاد آرہے تھے۔ ہم کتنا دکھی ہوتے ہیں جب کوئی ہماری سنیپس دیکھ رہا ہو اور ان کا رسپانڈ نہ کر رہا ہو۔ ہم ان سٹریکس کو کتنا سیریس لیتے ہیں اور جب کوئی جان بوجھ کر سٹریک توڑ دے تو اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔

یہ سب سوال وہ خود سے کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں اسے اذان کے وہ الفاظ یاد آئے جو نیم بے داری میں آج اس

کے کانوں میں پڑے، ''حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ''۔

وہ کافی دیر تک ان کو سوچتا رہا۔

''یہ بھی ایک سٹریک ہی تو ہے جو اللہ اپنے ہر بندے کو ہر روز بھیجتا ہے۔'' اس نے خود سے کہا۔

ہماری سٹریک توڑ دی جائے تو ہم اپنے دوستوں سے ناراض ہوتے ہیں اور ان سے دوبارہ سٹریک سٹارٹ نہیں کرتے جو سٹریک توڑ دیتے ہیں۔لیکن اللہ اپنی سٹریک نہیں توڑتا۔ وہ اس بات سے خفا نہ ہو کر بھی کہ ہم اس کی سٹریکس کو کوئی جواب نہیں دیتے ہمیں لگاتار سٹریکس بھیجتا رہتا ہے۔لیکن اس وقت کیا ہوگا جب وہ اپنی سٹریکس روک دے گا؟؟اس وقت ہم اس سے طلب کریں گے شاید وہ سٹریک دوبارہ سٹارٹ ہو لیکن وہ اب ایک حسرت بن چکی ہو گی۔اس کی آنکھیں خوف اور درد سے بھری تھیں۔

وسیم عباس

پڑھائی

زور زور سے الارم بجنے سے جب اس کی نیند میں خلل پڑا تو جھنجلا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جب اس نے موبائل اٹھایا تو دیکھا کہ سات بج رہے تھے۔ یہ اسی کا لگایا ہوا الارم تھا۔ اس نے سوچا پڑھائی کے لیے تو سارا دن پڑا ہوا ہے کیوں نہ ایک گھنٹہ اور آرام کر لیا جائے، آٹھ بجے اٹھوں گا اور پھر پڑھائی کروں گا۔ آٹھ بجے کا الارم لگایا اور سو گیا۔ جب اس کی آنکھ دوبارہ کھلی تو نو بج چکے تھے۔ اس نے سوچا کہ یہ فرقت کے لمحات کس قدر جلد گزر جاتے ہیں۔ اگر یہی دو گھنٹے کسی ریاضی کی کلاس کے ہوتے تو محبوب کی ہجر کی رات سے بھی کچھ طویل ہوتے۔ اس نے سوچا خیر ہی تو ہے، ابھی بھی بڑا وقت پڑا ہے پڑھائی کرنے کو۔ اس کے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ ابھی ہی پڑھائی شروع کر دوں۔ لیکن پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ ویسے بھی ناشتے کے لیے اس دن حلوہ پوری اور چنے تھے جو اس کی پسندیدہ ڈش تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ پہلے کچھ کھا لیا جائے اور پھر جم کر پڑھائی کی جائے۔ ویسے بھی بھوکوں پیٹ بھلا کسی سے کوئی کام ہوتا ہے۔

جب وہ پی ڈی سی (PDC) سے ناشتہ کر کے واپس آیا تو ساڑھے دس ہو چکے تھے۔ اب وہ پڑھائی کے لیے پوری طرح تیار تھا لیکن اچانک اس کے ذہن میں آیا کیوں نہ نہا دھو کر ہی پڑھائی شروع کی جائے۔ صفائی سے نہ صرف ذہن تیز کام کرتا ہے بلکہ اس کو اسلام میں نصف ایمان بھی قرار دیا گیا ہے۔ وہ پچھلی رات سونے سے پہلے ورزش کر کے آیا تھا جس وجہ سے اس کے جسم سے پسینے کی ہلکی سی بو آ رہی تھی۔ اس صورت حال میں پڑھائی میں کہاں دل لگے گا۔ بھلا اسی میں ہے کہ پہلے نہا دھو کر جسم و جان کی پاکیزگی کی جائے۔ جب وہ نہا دھو کر کمرے میں واپس آیا

اور خوشبو لگا چکا تو تقریباً گیارہ بج چکے تھے۔

اس نے کمرے میں ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ بے ترتیبی سے بکھری کئی چیزیں نظر آئیں۔ کمبل جو ابھی تک اسی طرح پھیلا پڑا تھا، جوتے اس کے سٹڈی ٹیبل کے نیچے تھے اور جرابیں دروازے کے پاس، اور دور سٹڈی ٹیبل کے سامنے ایک پانی کی بوتل پڑی ہوئی تھی۔ اس نے ان سب چیزوں کو ایک ترتیب سے رکھ دیا۔ اب اس کو پڑھائی شروع کرنے سے روکنے والا کوئی ظاہری بہانہ نہیں بچا تھا۔ اس نے بستہ اٹھایا، جو بستر کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ اسے اس نے پہلی نظر میں نہیں دیکھا تھا۔ سٹڈی ٹیبل پر بیٹھا ہی تھا کہ اسے سامنے بے ترتیبی سے پڑی ہوئی کتابیں نظر آئیں۔ سوچا کیوں نہ ان کو بھی ترتیب سے رکھ دیا جائے۔ بدانتظامی اور بے ترتیبی اس کے مزاج کو بالکل نہ بھاتی۔ اس نے درسی کتب کو ایک خانے میں رکھ دیا، ناولز کو دوسرے خانے میں، تاریخ و فلسفہ کی کتابوں کو، جو اس نے لائبریری سے عادتاً اٹھالی تھیں اور جنھیں اسے اکثر پڑھے بغیر ہی واپس کر دینا پڑتا، تیسرے خانے میں رکھ دیا اور باقی عمومی کتابیں (جیسے شاعری وغیرہ) کو ایک الگ کونے میں رکھ دیا۔

ان سب کو ترتیب میں رکھنے کے بعد وہ اس سوچ میں غلطاں ہو گیا کہ پڑھا کیا جائے۔ کوئی آدھ گھنٹہ اس سوچ میں گزر گیا اور بالآخر اس نے پڑھنے کے لیے سیاست کی درسی کتاب کا انتخاب کیا۔ ابھی وہ دو سطریں ہی پڑھ پایا تھا کہ اس کے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ کارل مارکس کی تھیوریز کو حقیقت میں تبدیل کیا جائے اور غریبوں کے حق میں انقلاب برپا کیا جائے۔ وہ خیالوں میں اس قدر کھوتا اور حقیقی دنیا میں اس وقت آتا جب باہر سے کوئی زوردار آواز آتی یا کوئی دوست اس کے کمرے میں آ پہنچتا۔ خیالوں سے جب وہ حقیقی دنیا میں آجاتا تو وہ ذہنی طور پر تھکاوٹ محسوس کرتا۔ سیاست کی کتاب چھوڑ کر تاریخ کی کوئی درسی کتاب اٹھا لیتا اور دو سطریں ہی پڑھ پاتا کہ اس کے ذہن میں خیالوں کا ایک جہاں آباد ہو جاتا۔ وہ ہر تاریخی واقعہ میں خود کو محسوس کرتا اور ہر ایک میں خود کو بہ طور ہیرو متعارف کرواتا اور ہیرو بن کر ابھرتا۔ جب وہ معاشیات کی کوئی درسی کتاب اٹھاتا اور سپلائی ڈیمانڈ کے دو بنیادی اصول پڑھتا تو حکومت کی معاشی ٹیم کی نااہلی پر گھنٹوں سوچ بچار کرتا۔

چوں کہ درسی کتابوں کی زبان مشکل ہوتی ہے، اس نے سوچا کیوں نہ کچھ اور اٹھالیا جائے تاکہ دماغ پر زیادہ

زور بھی نہ پڑے اور اچھی خاصی پڑھائی بھی ہو جائے۔ وہ مانتا تھا کہ پڑھائی سے انسان کی ذہنی سطح بلند ہوتی ہے، اس بات سے زیادہ فرق نہیں پڑتا کہ بندہ نصابی کتب پڑھتا ہے کہ غیر نصابی۔ اس وجہ سے اس کے پاس ہر طرح کی کتب ہوتیں۔ وہ تاریخ اور فلسفے کی کوئی غیر نصابی کتاب اٹھاتا اور ورق گردانی کرنے لگ جاتا لیکن پلے کچھ نہ پڑتا تو گھبرا کر اس کو وہیں چھوڑ دیتا۔ اسی اثنا میں سامنے پڑے ناول سے کوئی دیو مالائی کہانی اس کے دماغ میں آتی۔ وہ ناول اٹھالیتا اور پڑھنا شروع کر دیتا۔ اس کی عادت تھی کہ جب اسے کسی کتاب کو پڑھتے ہوئے درمیان میں ادھورا چھوڑنا پڑتا، وہ اس صفحے کو کنارے سے تہہ کر دیتا، تاکہ اگلی دفعہ وہاں سے دوبارہ شروع کر سکے۔ لیکن جب آج اس کو اس ناول کی پچھلی کہانی صحیح سے یاد نہیں آرہی تھی تو اسی وجہ سے جتنا بھی پڑھا اسے وہ صحیح سمجھ نہ پایا اور بالآخر جھنجلا کر اس نے اس کتاب کو بھی چھوڑ دیا اور شاعری کی ایک کتاب اٹھالی لیکن شاعروں کے مشکل الفاظ بھی اس کے پلے نہیں پڑ رہے تھے تو اس نے اسے بھی بند کر دیا اور رکھ دیا۔

کتابوں کی اس ورق گردانی میں اس نے کوئی تین گھنٹے گنوا دیے تھے۔ پڑھائی تو خیر سے کچھ خاص نہیں ہوئی لیکن کرسی پر تین گھنٹے بیٹھے رہنے سے اس کے دل کو ایک جعلی سی تسلی ملی تھی۔ سردی سے وہ کچھ زیادہ خوف کھاتا تھا، اس نے سوچا کیوں نہ باہر جا کر کچھ دھوپ سینکی جائے۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہاں سے جا کر کھانا بھی کھا لیا جائے اور پھر واپس آکر پڑھائی دوبارہ سے شروع کی جائے۔ اس کو یہ بات صحیح طور پر معلوم تھی کہ پچھلے تین گھنٹے میں جو اس نے جو یہاں ورق گردانی کرتے ہوئے گزار دیے ہیں، کوئی خاص پڑھائی نہیں ہوئی ہے۔ کتابیں کھول کر کھلونوں کی طرح ان سے کھیلنا اس کے بچپن کا مشغلہ تھا۔ یہ عادت اس کو تب لگی جب اس کے بچپن میں گھر والے اس کو پڑھائی کرنے کے لیے زبردستی کرتے تو وہ اسی طرح ٹائم گزار دیتا۔ کبھی وہ کاپی میں کوئی نقشہ بنا لیتا، کبھی ایسے ہی کچھ بھی لکھتا رہتا، سب کچھ کر لیتا سوائے پڑھائی کے۔

جب وہ دوپہر کے کھانے کے بعد کمرے کی طرف آرہا تھا تو اس کے ذہن میں آیا کیوں نہ عصر کی نماز بھی پڑھ لی جائے۔ کیا فائدہ ایسی پڑھائی کا جو بندے کو اپنے خالق سے دور کر دے۔ جب نماز پڑھنے کے بعد ہاسٹل میں اپنے کمرے میں آیا تو تقریباً تین بج چکے تھے۔ اب اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ خوب جم کر پڑھائی کی جائے لیکن

سامنے پڑی پانی کی خالی بوتل دیکھ کر اسے یاد آیا کہ کیوں نہ پانی بھر لیا جائے تاکہ پڑھائی کے دوران اگر ضرورت پڑے تو باہر جانا نہ پڑے۔ ابھی وہ ہاسٹل کی Pantry میں پانی بھرنے پہنچا ہی تھا کہ اس کے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ باہر گراونڈز پر ایک نظر دوڑائی جائے۔ اس کا کمرا چونکہ ہاسٹل کی پانچویں منزل پر تھا، اسے سارا منظر صاف صاف نظر آتا۔ اس نے دیکھا کہ کرکٹ گراونڈ میں کچھ لڑکے کھیل رہے ہیں جس سے اس کا دل مچل پڑا کہ وہ بھی کرکٹ کھیلے۔ اس کے اندر کا کرکٹر جاگ اٹھا اور ایک لمحے میں اسے بے چین کر دیا۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ ساری رات پڑی ہے پڑھائی کرنے کو، اگر یہ لڑکے چلے گئے تو پھر کرکٹ کھیلنے کے لیے اور کوئی ہے بھی نہیں۔ بہتری اسی میں ہے کہ پڑھائی کا ارادہ موقوف کر کے کرکٹ کھیلی جائے، اس طرح دل بھی بہل جائے گا اور جسمانی صحت بھی ٹھیک رہے گی۔

مغرب کی اذان بھی ہو گئی لیکن اس کی کرکٹ جوں کی توں جاری رہی۔ جب کرکٹ سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں واپس آیا تو دیکھا کہ چھ بج چکے ہیں۔ وہ کچھ تھکا تھکا محسوس کر رہا تھا اس لیے سوچا کہ کچھ آرام کر لیا جائے اور پھر دل لگا کر پڑھائی کی جائے۔ اس نے سوچا کہ ان فرصت کے لمحوں میں سوشل میڈیا کی دنیا سے کچھ لطف لے لیا جائے۔ وہ یہاں بھی کتابوں کی طرح ایک میڈیم سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے، اور اس سے چوتھے کی دنیا میں کھو جاتا۔ سب سے پہلے اس نے 'فیس بک' کھولا، کچھ دوستوں کی تصویریں دیکھیں اور کچھ فیس بکی دانش وروں کی 'فیس بکیاں' بھگتیں۔ فیس بک کے بعد اس نے 'انسٹا گرام' کھولا، تصویروں کی وہ اعلیٰ کوالٹی کہ وہ انھیں دیکھ کر دنگ رہ جاتا۔ گاؤں کا وہ عبدل بھی یہاں پر ہریتک روشن بنا نظر آتا۔ زیادہ انسٹا گرام دیکھنے سے وہ اکثر احساس کم تری کا شکار ہو جاتا۔ اس غم کو غلط کرنے کے لیے وہ ٹویٹر (Twitter) کھول لیتا اور صحافیوں، کھلاڑیوں، سیاستدانوں اور اداکاروں کے بے تکے مگر مختصر پیغامات کو بڑے غور سے پڑھ لیتا۔ پھر وہ سنیپ چیٹ (SnapChat) نامی ایک ایپ پر کچھ وقت گزارتا اور بالآخر واٹس ایپ کھول لیتا۔ ان سب میسجز کا جواب دیتا جو اسے موصول ہوئے ہوتے۔ اس ایک دائرے کو پورا کرنے تک پچھلی ایپز (Apps) میں اتنے پیغامات آ چکے ہوتے کہ اسے سب کو ایک بار پھر دیکھنا پڑتا۔ سوشل میڈیا کی اس مصنوعی دنیا میں اگر کوئی کھو جائے تو اس کے لیے باہر نکلنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ بڑے بڑے دانش ور بھی اس موذی مرض کا شکار ہو کر لاعلاج ہو چکے ہیں۔ خیر کوئی دو گھنٹے اس مصنوعی دنیا میں قید رہنے کے

بعد وہ خود کو باز یاب کرانے میں کامیاب ہوا۔

اس بار جب اس نے موبائل چھوڑا تو دیکھا کہ آٹھ بج چکے ہیں، ذہن میں آیا کہ پڑھائی شروع کر دوں لیکن جب آپ دو گھنٹے کسی سکرین کو دیکھتے رہے ہوں تو آپ کا ذہن کیا خاک کام کرے گا۔ سو چا، ویسے بھی کرکٹ کی وجہ سے تھکن ہوئی اور بھوک لگی ہوئی ہے۔ پہلے جا کے شام کا کھانا کھا لیا جائے اور پھر رات گئے تک جم کے پڑھائی کی جائے۔

کھانے سے واپسی پر جب دیکھا کہ اس کے دوست ہاسٹل کے باہر لگی کرسیوں پر بیٹھے گپیں مار رہے ہیں، اس کا بھی دل کیا کیوں نہ ان کے ساتھ بھی کچھ وقت گزار لیا جائے۔ پڑھائی نے تو ساری عمر جان نہیں چھوڑنی، کیوں اس چکر میں دوستوں کے ساتھ کچھ ہنسی مذاق کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے دیا جائے۔ یہی لمحات تو زندگی کا اصل اثاثہ ہوتے ہیں۔ اس کی اپنے دوستوں کے ساتھ ہر معاملے پر بات ہوتی سوائے پڑھائی لکھائی کے۔ اس کے دوست دنیا جہاں کے ہر معاملے پر اپنی رائے دیتے اور پوری اتھارٹی کے ساتھ دیتے جیسے ان کی رائے حرفِ آخر ہو۔ وہ سیاستدانوں کے ملک لوٹ کے کھا جانے پر کڑھتے نظر آتے۔ سیاسی معاملات میں فوج کی مداخلت اس کو ایک آنکھ نہ بھاتی، وہ معلموں کو اپنی ذمہ داریوں سے صحیح طور پر عہدہ برا نہ ہونے پر کوستے رہتے۔ وہ صحافیوں کو امیروں کے اشاروں پر ناچنے کی وجہ سے سخت ناپسند کرتے، وہ ادیبوں کی معاشرے میں پائی جانے والی ناانصافیوں پر خاموشی کو مجرمانہ غفلت گردانتے اور کرکٹرز کو کرکٹ سے کروڑوں روپے کمانے کے باوجود صحیح توجہ نہ دینے پر ناقابل معافی مانتے۔ غرض کہ انھیں معاشرے کے ہر کردار سے شکایت تھی۔ ان سب کو صرف ایک ہی بات کی کوئی فکر نہیں تھی اور وہ بات ان کی پڑھائی تھی۔ وہ ان سب بحث مباحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے، کبھی کبھی وہ غصے میں اِدھر اُدھر بھی نکل جاتا، لیکن ایسے میں اس کے دوست اسے سنبھال لیتے۔

آج جب وہ دوستوں کی محفل سے اٹھ کر کمرے کی طرف آیا تو رات کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے پھر سوچا کہ پڑھائی شروع کی جائے لیکن جو ذہنی و جسمانی تھکن اس کو کرکٹ کھیلنے، سوشل میڈیا کے استعمال اور دوستوں کے ساتھ کی گئی گپ شپ کی وجہ سے ہوئی تھی، اس قدر شدید تھی کہ اس کا دل پڑھائی میں بالکل

نہیں لگا۔اس نے ایک آدھ بار کتاب کھول کر پڑھنے کی کوشش بھی کی لیکن فی الحال اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ایک بار اس نے اس مقصد کے لیے نصابی کتب اٹھالیں کہ دیکھ لے کہ اُس نے کتنے سبق آج کے دن پڑھے ہیں۔وہ حیران تھا کہ سارا دن لگانے کے باوجود اُس نے وہ سبق نہیں پڑھے جو اُس نے پچھلے سوچا تھا کہ آج پڑھ لے گا۔اس نے سوچا چلو آج کا دن تو نکل گیا اور تھکن بھی بڑی ہوئی ہے،اس لیے آج مزید پڑھائی نہیں کرنی۔

وہ اٹھا، لائٹ بند کی، بستر پر دراز ہو گیا اور موبائل اٹھالیا اور صبح سات بجے کا الارم لگا یا۔اس کے بعد وہ پورا کمبل اوڑھ کر اوندھے منہ سو گیا۔

لیٹے لیٹے اس کی ایک خفیف سی آواز نکلی: ''صبح سے تو ضرور پڑھائی کروں گا''۔

اور ذرا زور سے کہا: ''ان شاءاللہ''۔

شہر بانو

کریٹورائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

لیڈر باجی اور عاصمہ: راشن کی کہانی

''راشن دے دیں، میرے حصے کا راشن دے دیں۔'' عاصمہ چلاتی رہی۔ کسی سٹوڈنٹ کی سفارش بھی تھی اس کے پاس۔ راشن ملا تو سہی لیکن آدھا اور سو روپیہ بھی لے لیا اس سے۔ وہ لیڈر باجی بول رہی تھی سو روپیہ اس لیے سب سے لے رہے ہیں تاکہ کسی کو یہ نہ لگے کہ خیرات ہے۔ یقین مانیے ایسی عجیب بات عاصمہ نے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ پھر پتا نہیں اور کیا عجیب وغریب باتیں کر رہے تھے کہ مزدوروں کی طاقت بنائیں گے اور ساتھ لڑنا ہے۔ دس دن سے عاصمہ کے گھر راشن نہیں تھا۔ ادھر ادھر سے مانگ کر گزارا کر رہی تھی اور ابھی مل تو گیا لیکن آدھا۔ اس کی بھابھی کو تو پورا ملا تھا۔

عاصمہ سے برداشت نہ ہوا کہ آدھا کیوں ملا، جب ایک سٹوڈنٹ کی سفارش بھی تھی۔ ہاں! جس سکول میں وہ سال پہلے کام کرتی تھی، اسی بچی نے بتایا تھا کہ وہ یہاں لدھڑ پنڈ میں ورکر ساتھ کے گھر سے راشن دے رہے ہیں۔ وہ عاصمہ سے بولی کہ آپ کے محلے میں آئیں گے تو آپ لے لینا۔ لیکن عاصمہ کو اسی وقت چاہیے تھا، وہ مجبور تھی۔

لیکن یہاں لدھڑ میں اسی طرح کی باجی کو لیڈر بنایا ہوا تھا اور وہ حکم چلا رہی تھی۔ کہتی تھی اور ہے نہیں۔ عاصمہ آگ بگولا ہو گئی اور سٹوڈنٹ کو فون کرنے لگی کہ درحقیقت لیڈر باجی اپنی جان پہچان والوں میں بانٹ رہی ہے۔ لیڈر باجی نے سٹوڈنٹ پر پتہ نہیں کیسا جادو کیا تھا کہ وہ بھی الٹا عاصمہ سے لڑنے لگی۔ یہ آپ کو نہیں پتا، لیڈر باجی نے کیسے خون پسینہ ایک کر کے یہ کام کیا ہے۔ عاصمہ کو پہلے تو تعجب ہوا اور پھر سٹوڈنٹ پر غصہ آیا، بہت غصہ آیا۔ یہ کیوں بن گئی لیڈر؟

غصہ، حسد اور تکلیف سے عاصمہ نے اور چلانا شروع کر دیا تو سٹوڈنٹ نے فون بند کر دیا اور اس کے استاد کا فون آ گیا۔ وہ بھی عجیب ہی تھا، میرا نام نعمان ہے، ہم مزدور تنظیم بنانا چاہتے ہیں۔ اس نے بھی عاصمہ کی ایک نہ سنی اور لیڈر باجی کی حمایت میں تقریر کرتا رہا۔ عاصمہ نے غصے میں فون بند کر دیا اور راشن کی طرف دیکھ کر کوسنا شروع کر دیا۔

بچے بہت خوش تھے کہ آج کھانے کو ملے گا لیکن عاصمہ پورا وقت لیڈر باجی، سٹوڈنٹ اور استاد کو بس گالیاں بکتی رہی۔ یہ ہوتی کون ہیں لیڈر بننے والی۔ لعنت بھیجتی ہوں میں۔ یہی سوچتے سوچتے عاصمہ کی آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ وہ خود لیڈر ہے اور اپنے گھر سے راشن دے رہی ہے اور بول رہی ہے ''اب بتاؤ کون ہے لیڈر''۔

محبوب علی

کریٹورائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

نسیم کی لاش

اس گاؤں کے لوگ ہر سال مارچ میں اپنے مال مویشی لے کر نالے کا رخ کرتے جو گاؤں سے تقریباً چار گھنٹے کی مسافت پر واقع تھا۔نور بی بی بھی ان لوگوں میں شامل تھی جو اپنی جوان بیٹی نسیم اور بوڑھے شوہر کے ہمراہ اکیس مارچ کے فوراً بعد ہی نالے پہنچ جاتی اور اپنی جھونپڑی کی مرمت کرتی۔ستمبر میں برف پڑنے سے پہلے گاؤں آ جاتی۔ پہلے کی طرح اس سال بھی گاؤں کے آدھے لوگ ایک ساتھ اپنے مال مویشی لے کر نکلے جو اُن کے باہمی اتفاق اور مل کر رہنے کی ایک نشانی بھی سمجھی جاتی تھی۔

صبح سویرے جب سارے نکلتے تو ایک عجیب شور وغل کا سماں ہوتا۔ بھیڑ، بکریاں، گائیں، بھینسیں، گدھے، بیل اور چند گھوڑے سب ساتھ ہوتے اور اپنی اپنی آوازیں نکالتے۔بکریاں، بھیڑ اس مشترکہ ریوڑ میں اپنے اپنے بچوں کو ڈھونڈتے ہوئے مَیں مَیں کرتے اور پہنچنے تک یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس کا بچہ کہاں ہے صرف گونجتی آوازیں سنائی دیتی۔ البتہ لوگوں کو پتا چل جاتا کہ ان کے مویشی کون سے ہیں۔ ہر ایک نے اپنے بھیڑ بکریوں کے سینگوں اور جسموں پر مختلف رنگ کیے ہوتے اور اس سے بہ آسانی پتہ چلتا۔ نالہ پہنچ کر سب نے اپنے اپنے گھروں میں دیسی گھی اور دودھ سے بنے کھانوں سے ایک دوسرے کا استقبال کیا۔آگ جلا کر اسے ہاتھ میں لے کر پورے گھر کا چکر لگاتے جو گھر کو پاک کرنے کی ایک نشانی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ روٹی کے ٹکڑوں کو جھاڑیوں اور چھوٹے چھوٹے درختوں پہ لٹکا دیتے تاکہ پریاں خوش ہو جائیں جن کو لوگ نالے کا اصل مالکان سمجھتے تھے جو ان لوگوں کی ایک رسم تھی۔

اس سال نور بی بی نے نہ درختوں پہ روٹی لٹکائی اور نہ ہی گھر کو آگ سے پاک کیا۔جس سے اسے لوگوں کی تنقید کا

بھی سامنا کرنا پڑا کہ رسومات ادا نہ کرنے سے ان کی دولت میں کمی آسکتی ہے اور کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس سے لوگوں میں ایک وہم ضرور پیدا ہوگیا کہ پہاڑوں کے باسیوں (پریوں) کو اس نے ناراض کیا ہے اور نور بی بی خود بھی وہم میں مبتلا ہوگئی کہ اس سے غلطی ہوگئی ہے کیوں کہ یہ سب پہلے دن ہی کرنا ہوتا تھا۔

وقت گزرتا گیا اور لوگ اپنے اپنے معمولاتِ زندگی میں مصروف ہوگئے۔ جولائی میں سارے لوگ ایک مذہبی رسم ادا کرنے گاؤں آگئے اور مال مویشیوں کی رکھوالی کے لیے رحیم شاہ کو مختص کیا۔ رحیم شاہ ایک قدآور شخص تھا اور سب کو اس پر بھروسا تھا۔

رات رحیم شاہ حسبِ معمول اپنی بندوق صاف کررہا تھا، دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولنے پر ایک لمبا تڑنگا آدمی سرتاپا سفید اندر داخل ہوا۔ اس نے رحیم شاہ سے چائے بنانے کا کہا۔ چائے پی کر وہ رحیم شاہ کے ساتھ گپ شپ میں مصروف رہا اور اسے کہا کہ وہ مارخور کا شکار چھوڑ دے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اکیلے نالے میں نہ بیٹھے، پھر وہ ان سب لوگوں کے نام لینے لگا جو مر گئے تھے اور نالے سے پہلے کے باشندے تھے۔ اس کے بعد اس نے رحیم شاہ سے بستر بچھانے کا کہا۔ رحیم شاہ حیران و پریشان بستر بچھانے لگا اور وہ شخص سو گیا۔ رحیم شاہ کو ڈر بھی لگنے لگا اور وہ دروازے کی کنڈی لگا کر خود بھی لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد رحیم شاہ کچھ خیالوں میں گم ہوگیا اور چند ہی لمحوں میں وہ چونک اٹھا کہ وہ شخص غائب ہے اور دروازے کی کنڈی اسی طرح لگی ہے۔ صبح ہوتے ہی رحیم شاہ نالے سے گاؤں آیا اور لوگوں کو کہانی سنا کر خود بیمار پڑ گیا۔ اگلے ہی دن سب لوگ نالے پہ پہنچے اور کئی دن تک ایک خوف سا رہا پھر لوگ بھول گئے اور اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔

چند ہی دن میں بارشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ آدھے لوگ گاؤں آگئے اور آدھے بارشوں کے ختم ہونے کا انتظار کرنے نالے میں ہی بیٹھ گئے۔ ۲۱ جولائی کی رات سب لوگ سو چکے تو اچانک قدرت خان کی آنکھ کھلی اور ندی کے پانی کی آواز اسے بہت اونچی سنائی دی۔ وہ مارے ڈر کے باہر نکلا لیکن گھپ اندھیرے میں اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ واپس جا کے اس نے سب کو جگایا، کوئی لالٹین جلانے کی کوشش کرنے لگا، کوئی اپنے مال مویشی کو مویشی خانوں سے نکالنے کی کوشش میں مصروف ہوگا۔ نسیم کو گہری نیند میں اپنے سارے بستر گیلے محسوس ہونے لگے، وہ حیران اور پریشان ہوکر اٹھی۔ لالٹین

ڈھونڈنے کی کوشش میں ادھرادھر ہاتھ مارنے لگی۔ اچانک اس کا ہاتھ پانی میں چلا گیا، وہ چیخی۔ نور بی بی بھی جھٹ سے اٹھی۔ گھر کو چاروں طرف سے پانی نے گھیرا ہوا تھا۔ ہر کوئی اپنی جان بچانے میں مگن تھا، نور اور نسیم کا کس کو خیال آیا۔

نور بی بی چیخ پکار میں پانی میں تیرتے ہوئے دروازے سے باہر نکلی، نسیم دروازہ ڈھونڈتے اندر ہی رہ گئی۔ نور بی بی کو پانی تھوڑا نیچے تک بہا کے لے گیا لیکن وہ ایک طرف نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ گھر کے در و دیوار گر گئے، نسیم باہر نکلی لیکن پانی کاندھوں تک آچکا تھا۔ اس رات خوف اور چیخ و پکار میں نسیم کی چیخ سب سے بلند اور خوف ناک سنائی دی: ''امی مجھے بچاؤ! کوئی بچاؤ!'' نسیم کافی دیر پانی کے اندر درختوں کے جڑوں اور شاخوں کو پکڑ کر چیختی رہی لیکن کس کی ہمت کہ آگے بڑھے۔ نور بی بی اپنی بیٹی کی سسکیوں اور چیختی آواز کو برداشت نہ کر پائی اور بے ہوش ہوگئی۔

صبح نسیم کی لاش تھوڑے ہی فاصلے پر پانی کے اندر درختوں کے ساتھ پھنسی ہوئی ملی۔

صبیح احمد

کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

ذات

خزاں کا موسم تھا اور کچی سڑک پر پتے ہی پتے بکھرے ہوئے تھے۔ چند دن پہلے ہونے والی بارش کی وجہ سے سڑک بھی کچھ گیلی تھی۔ کئی جگہوں پر تو بیل گاڑی کے چلنے کی وجہ سے کیچڑ تقریباً دلدل بن چکا تھا۔ اسی طرح کی کیچڑ میں اس کا پاؤں آیا تو جوتا وہیں رہ گیا۔ وہ فوراً مڑا اور جھک کر جوتا کھینچنے لگا۔ کچھ تگ و دو کے بعد کیچڑ میں لت پت جوتا پھر اس کے پاؤں میں تھا اور وہ چلنے لگا۔ ایک قدم سیدھا اور دوسرا ہر بار کچھ پھسلتا ہوا نہ جانے کس چیز کی تلاش میں تھا۔ رات کا تیسرا پہر ہونے کے باوجود سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ چاند اپنے جوبن پر جو تھا۔ اس کے چاروں اطراف میں دور دور تک کھیت ہی کھیت تھے۔ کچھ خالی جو اپنی مٹی میں بیجوں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ بھرے ہوئے کیوں کہ ان میں سرسوں کی فصل دھیمی ہوا میں ہل رہی تھی۔ کچھ اداس تو کچھ خوش۔ اکا دکا کھرے بھی نظر آ رہے تھے جو ہر شخص نے اپنی زمین میں بیٹھنے اور رہنے کے لیے بنا رکھے تھے۔ البتہ ان میں جانوروں اور چوکی داروں کے علاوہ کوئی نہ رہتا تھا۔ وہ چلتا رہا۔ کافی دیر بعد اس کے قدم اچانک ٹھہر گئے۔ اس کو بتائی گئی کہانی میں تو یہاں دو کمرے پکے تھے۔ اینٹ اور سیمنٹ، اس نے سوچا۔ لیکن باقی تفصیل تو بالکل درست تھی۔ تین فٹ کی دیوار، بڑا سا احاطہ۔ ایک چھوٹا کمرہ، ٹیوب ویل کے لیے دوسرے کونے میں، درمیان میں علاقہ کا سب سے قدیم بوہڑ کا درخت جس کا وسیع وعریض محیط پورے ڈیرے میں روشنی کیے ہوئے تھا۔ اور وہ چیز جو کہ وہ دیکھنے آیا تھا۔ جو اس کو سونے نہ دیتی تھی، اس کی آنکھوں میں خون اتارے ہوئے تھی۔ جو در حقیقت خون کی ایک دھار تھی اور سامنے والی دیوار کے بالکل بیچ میں سے اور سوئے ہوئے چوکی دار کے جسم کو چیرتی ہوئی اس کو گھور رہی تھی۔

اتنی سخت سردی تو ان دونوں کے ہوش میں کبھی نہیں پڑی تھی۔ ٹھٹھرتے ہوئے وہ بھاگتے جا رہے تھے۔ موسم تو ان کے لیے کچھ معنی نہ رکھتا تھا کیوں کہ اس وقت رکنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس کچی سڑک پر وہ دونوں سکون سے چل رہے تھے۔ ان کے پھینکے ہوئے مالٹوں کے چھلکوں نے جڑی بوٹیوں کے لیے کھاد کا کام دیا تھا۔ ان کے قدموں نے اس کے اندر کئی گڑھے بنائے تھے۔ لیکن آج اسی سڑک پر ان کے اندر خوف کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ان کی بچپن کی ساتھی آج ان کے لیے خطرے سے کم نہ تھی۔ وہ بوہڑ کے درخت والے ڈیرے تک پہنچ چکے تھے جس میں کوئی چوکی دار نہ ہوتا تھا۔ یہ بات زبانِ زد عام تھی کہ اس زمین کے مالک شہری بابو کو چوکی دار نہیں پسند تھے۔ وہ دونوں اس ڈیرے کے سامنے والی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور کونے میں پڑی گندی چادر اپنے اوپر لینے کا سوچنے لگے۔ چادر کے نیچے سے کانپتے ہاتھوں نے ایک بچے کی تصویر نکالی۔ کچھ ہی دیر میں آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی تصویر ان دونوں کے ساتھ صبح اور خدائی مدد کا انتظار کر رہی تھی۔

برسات کے موسم میں کپاس کی فصل تیار کھڑی تھی۔ اس موسم میں زمین دار اکثر دیہاڑی پر لوگوں کو فصل چننے کے لیے بلاتے ہیں۔ وہ دونوں بھی وہیں ملے تھے۔ بوہڑ کے درخت کے نیچے شہری سیٹھ نے ان سب کو دیکھا تھا اور کام پر لگ جانے کی تاکید کی تھی۔ کئی دن وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، کبھی دیہاڑی کے پیسے لیتے وقت، کبھی فصل میں کام کرتے وقت، کبھی کھانا کھاتے وقت، کبھی ویسے ہی۔ کچھ کہنے کو تھا دونوں کے پاس لیکن کہا نہیں جا سکتا تھا کیوں کہ وہ تو ایک دوسرے کے لیے نہ تھے۔ وہ اعوان تھا اور وہ میو تھی۔ اس کے گھر والے کبھی قبول نہ کرتے۔ خیر۔ وہاں تک بات پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔

ایک رات وہ کچھ کپاس چوری کرنے کی نیت سے فصل پر پہنچا تو اس کو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ایک کھیت کے بیچ میں وہ بھی رات کے اندھیرے میں کچھ مزید پیسے کے لالچ میں کپاس چُن رہی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں چلا گیا۔ جو نہ کہا جانا تھا وہ اس رات کہہ دیا گیا اور جو ہرگز نہ کیا جانا تھا وہ اس رات وہ کر گزرے۔ جب وہ لوگ وہاں سے نکلے، زمین کے اس ٹکڑے پر فصل کی وہ حالت تھی جیسے کسی سور نے اودھم مچایا ہو۔

''ضرور کسی سور کا کام ہے یہ۔'' اگلی صبح ایک مزارعے نے کٹائی کے نگران عابد اعوان سے کہا۔

لیکن عابد بہ خوبی جانتا تھا کہ یہ کسی سور کا کام نہیں تھا۔ اس رات دونوں گھروں میں خوب تماشا ہوا۔ دونوں خاندانوں نے پہلے جذبات میں دوسرے خاندان کے ملوث فرد کو مارنے کی قسم کھائی اور جب اندازہ ہو گیا کہ یہ ممکن نہ تھا، اپنے اپنے گھر کے فرد کو ہی مارنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ دونوں اتنی دیر میں جان بچا کر بھاگ چکے تھے۔ اس دن ذات کا سارا فرق پامال ہو گیا تھا۔ دونوں خاندان یک جا ہو کر ان کو ڈھونڈنے نکلے۔ اس وقت کوئی نچلی ذات کا تھا اور نہ کوئی بہتر ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ سب ایک ہی تھے اور اپنی اپنی عزت کو دو نہتے اور خوف زدہ لوگوں میں ڈھونڈنے پر ڈٹے ہوئے تھے۔ ان کو جاتا دیکھ کر گاؤں کے پنساری شریف بخش نے آواز لگائی۔

''عابد اعوانے! تیرے بھائی کو میں نے ادھر جاتے دیکھا ہے۔''

''میرا کوئی بھائی نہیں۔'' عابد نے غصے سے جواب دیا۔

''تو وہ کون تھا جو ابھی اس کے ساتھ ادھر کو بھاگا ہے۔'' طنزیہ جواب ملا۔

غصے سے اس کے اعصاب پھول گئے۔ شریف بخش کی ادھڑی ہوئی لاش نے سب کو یہ اشارہ دے دیا تھا کہ گاؤں میں عابد کا کوئی بھائی کبھی نہ ہوا کرتا تھا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہجوم آخر ڈیرے تک آ ہی پہنچا۔ کانپتا ہوا ایک ہاتھ دیوار کے ساتھ لگی چادر میں سے باہر نکلا۔ وہ آگے بڑھا اور دیوار نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ خون کے چھینٹے اس کو نظر نہ آئیں۔ آتے جاتے لوگوں کے ذریعے بات پھیلتی گئی۔ کچھ عرصے بعد ایک ادھ جلی تصویر بھی شہر میں اس کے دوست کے گھر پہنچ گئی۔ بچے کو نہ پتا تھا کہ وہ تصویر اس کی تھی۔ وہ بڑا ہوتا گیا۔ سرگوشیوں میں کہی گئی کہانی اس نے کئی بار ٹکڑوں میں سنی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ ٹکڑے جوڑ کر اس کو ایک باضابطہ شکل دے چکا تھا۔ ایک دن تو اس نے سب سے برملا پوچھ ہی لیا۔ اس دن کوئی بات ڈھکی چھپی نہ رہی۔ اور آج اس بات کی وجہ سے وہ یہاں تھا۔ اور اسی بات کی وجہ سے اس کے ساتھ چارپائی کے نیچے چوکی دار کی لاش اور ایک خون آلود اینٹ پڑی تھی اور اسی بات کی وجہ سے اس کی نم آنکھیں صرف خون کی دھار پر جمی ہوئی تھیں۔

سورج ابھی نکلا ہی تھا لیکن ڈیرا خالی نہ تھا۔ ایک بڑی گاڑی کے پاس زمینوں کا نگران اور مہنگے کپڑوں میں ملبوس شہری مالک کھڑا تھا۔ نگران کی نظریں گھٹنوں کے بل بیٹھے شخص پر تھیں جس کی پیٹھ ان کی طرف تھی۔

''تم سے کتنی بار کہا ہے کہ اس دیوار پر قلعی کروالو۔ پتا نہیں کس جانور کا خون لگا ہے۔ اور یہ بندہ کون ہے؟''

''مینوں نہیں پتا!'' نگران نے کہا۔

''دیکھنے میں تو تمھارے بھائی جیسا ہے۔'' سیٹھ نے احتیاط سے کہا۔

''میرا کوئی بھائی نہیں۔'' اس نے حتمی انداز سے کہا۔

''تو وہ کون تھا جو ہمارے کھیتوں میں کپاس چگتا تھا۔ مجھے نورے نے اشارے سے ایک بار دکھایا تھا۔ میں چہرے نہیں بھولتا۔''

''یہ والا بھول گئے۔''

اس نے چہرہ سیٹھ کی طرف موڑا۔ ''میں نے بتایا نا، کہ میرا کوئی بھائی نہیں۔''

اس کا چہرہ وحشیانہ ہو چکا تھا اور اس کی آنکھیں دیوار پر موجود دھار کی عکاس تھیں۔ دیوار نے آہ بھر کر آنکھیں بند کرلیں۔ اگلے کچھ لمحے دیکھنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

آمنہ ذوالقدر

اردو افسانہ: منٹو، بیدی اور غلام عباس کے افسانوں کا خصوصی مطالعہ

تھوڑا سا

وہ بستر پر اپنا لہنگا پھیلائے بیٹھی ہے۔ پھولوں کی پتیاں صرف بستر پر ہی نہیں بلکہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہیں۔ کئی لڑیاں دیوار سے جھول رہی ہیں۔ اس کا سرخ لباس، ان پتیوں کی سرخی میں ہی گھل مل گیا ہے اور اس نے اپنے دوپٹے سے اپنے پورے وجود کو ڈھانپ رکھا ہے۔ میں نے اس کا چہرہ تقریباً ایک گھنٹہ پہلے آخری بار دیکھا تھا۔ اس کے بعد مجھے مہمانوں میں الجھا دیا گیا جب کہ اسے امی اور خالہ تب ہی کمرے میں لے آئے تھے۔ اُس وقت اس کے چہرے پر معصومیت اور عجیب سی گھبراہٹ نمایاں تھی۔

وہ پورا گھنٹہ جو میں نے مہمانوں میں گزارا تھا، اس میں مجھے صرف اس کی گھبراہٹ کی فکر ہو رہی تھی۔

میں فوراً کمرے میں جا کر اس کا من بہلانا چاہتا تھا۔ آخر میں جانتا ہوں کہ یوں ایک دم پرائے لوگوں اور پرائے گھر میں گھل مل جانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن، میں بھی تو اس کے لیے اجنبی ہی تھا، اس کا من آخر مجھ سے کیسے بہلے گا؟ لیکن وہ میرے لیے ہی تو اس پرائے گھر میں آئی تھی۔

کمرے میں داخل ہو کر جب میں اس کا چہرہ فوراً نہ دیکھ پایا اور اس گھبراہٹ کے بارے میں بھی نہ جان پایا تو میں چڑ چڑا ہو گیا۔ اسی چڑ چڑے پن میں مَیں نے دروازے کا پٹ بند کرنے کی غرض سے زور سے دے مارا۔ اس پر وہ فوراً چونک سی گئی اور اپنا گھونگھٹ اوپر اٹھا کر مجھے بڑی بڑی، کاجل سے لیس آنکھوں سے گھورنے لگی۔ اس کے چہرے پر اب بھی گھبراہٹ عیاں تھی لیکن وہ اجنبیت کی گھبراہٹ نہیں تھی اور میرے لیے اس لمحے یہ ہی کافی تھا۔

وہ چند لمحوں کے لیے مجھے یوں خاموشی سے دیکھتی رہی اور میں بھی نہ جانے کن خیالات میں گم، خاموش رہا۔

پھر جب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اب بھی دروازے کے زور سے بند ہو جانے پر حیران ہے تو میں نے فوراً اس کے اطمینان کے لیے کہا: ''سوری........وہ بس.......اچانک.......''

یہ سنتے ہی اس کے چہرے پر اطمینان کا رنگ چھا گیا اور میں نے سوچا کہ میں کتنا بے وقوف ہوں۔ نہ جانے اس نے کیا سوچا ہوگا کہ میں شاید کوئی خبطی مرد ہوں۔ لیکن اس کے چہرے پر اطمینان کے فوراً بعد آنے والی مسکراہٹ نے میرے دل کو تھوڑا سا سہلا دیا۔

''تو آپ آ گئے!'' اس نے اس انداز میں کہا جیسے وہ مجھے ہمیشہ سے جانتی ہے۔ اس کے اس لہجے کو سن کو مجھے یہ احساس ہوا کہ چلو، وہ خود کو میرے ساتھ اجنبی محسوس نہیں کر رہی لیکن ساتھ ہی مجھے خود پر حیرانی ہوئی کہ میں چاہ کر بھی اپنی گفتگو سے اجنبیت کے فاصلے کو مٹا نہیں پایا۔

''ہاں!'' میں نے سوچا کہ اب آگے شوخ انداز میں کہہ دیتا ہوں کہ: آخر آپ کو کتنا انتظار کرواتا۔ لیکن میری زبان تو جیسے کسی شوخ جملے کے لیے بنی ہی نہیں۔ اس لیے میں بس یہی کہہ پایا، ''سب ہی سونے چلے گئے اب تو۔'' جب کہ ایسا بالکل نہیں تھا۔ گھر میں اس وقت بھی اسی طرح رونق تھی جیسے صبح کے گیارہ بج رہے ہوں۔ مجھے چھوٹے چچا نے کئی بار روکا تھا کہ میں کچھ دیر اور ان کے پاس بیٹھ جاؤں۔ چوں کہ ان کی اور میری کافی بے تکلفی تھی لہٰذا انھوں نے کئی مرتبہ بیوی کے آ جانے پر دوست کو بھول جانے کا طعنہ بھی مارا تھا۔ لیکن میں تو صرف اس کے لیے ہی محفل چھوڑ کر جلدی آیا تھا۔ لیکن میں اس بات کا اعتراف نہ جانے کیوں نہ کر پایا۔

''چلیں! بھلا ہو سب کا۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اس ادا سے مسکرائی کہ میرا بے ساختہ جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لوں۔ لیکن اس کے اگلے ہی جملے پر میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

''مجھے تو لگا تھا کہ آپ اب کبھی نہ آئیں گے اور مجھے نہ جانے برسوں انتظار کرنا ہوگا۔''

اس نے یہ جملہ بھی نہایت چنچل انداز میں کہا تھا لیکن اس جملے کی سچائی کا تیر میرے دل میں گڑھ گیا اور میں نے تکلیف کو دبانے کے لیے اپنا داہنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔ میرے سینے سے اٹھتی گرماہٹ کو میرے لمس نے محسوس کیا اور اس نے بھی۔ اس کی آنکھوں میں گھبراہٹ اور خوف کی نمی چھا گئی۔

اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا تو میرے سینے میں دھنسے زخم سے خون رس کر زمین پر بکھری گلاب کی پتیوں میں گھلنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کا رنگ بھی ان پتیوں میں جا کر ملتا گیا۔ میں اس کے آنسو پونچھنے کے لیے آگے بڑھنا چاہتا تھا پر اس زخم نے چند لمحوں میں ہی میری تمام سکت کو چھین لیا۔ میں نے اس کی تکلیف سے نظریں چرانے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے گرد تاریکی اور زمین پر بکھری پتیوں کے علاوہ کچھ نہ تھا اس کا آخری جملہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

''آپ اب کبھی نہ آئیں گے اور مجھے نہ جانے برسوں انتظار کرنا ہوگا۔''

میں اس وقت جس کیفے میں بیٹھا ہوں اسے Dater's No. 1 Choice مانا جاتا ہے۔ میں یہاں کیا کر رہا ہوں، مجھے نہیں معلوم۔ میں اس کا انتظار کر رہا ہوں لیکن وہ تو میں پچھلے تین سال سے کر رہا ہوں۔ جس طرح وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔ میرے ساتھ والی میز پر بیٹھا نوجوان ہر دو منٹ بعد بے تابی سے اپنی گھڑی دیکھتا ہے۔ کیوں کہ اسے یقین ہے کہ اس کی محبوبہ چند لمحے میں اس کے سامنے ہوگی۔

اس نے پھر مجھے خط لکھا ہے۔ اس نے مجھے اب تک اتنے خط لکھے ہیں کہ اس خط میں لکھی تقریباً ہر بات وہ پہلے کے خطوط میں بھی کہہ چکی ہے۔ صرف یہ بات نئی ہے کہ ماہ نور اب تین سال کی ہوگئی ہے اور اس نے بہت جتن کر کے اسے لفظ ''بابا'' سکھایا ہے لیکن وہ پریشان ہے کہ ماہ نور ہر چیز کو ہی اب بابا کہتی ہے۔ وہ مجھ سے سوال کر رہی ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ کتنی احمق ہے نا وہ بھی! اسی لیے میں خطوط میں لکھی اس کی باتوں سے زیادہ کاغذ پر کندہ اس کے لمس کے نقش کو پڑھتا ہوں۔

میں ہر جملے کو چھو کر بتا سکتا ہوں کہ اس کی اس لمحے کیا کیفیت تھی۔ جب وہ لفظ ''یاد'' اور ''محبت'' لکھتی ہے تو میں خود کو اس کے آمنے سامنے اس رات کی طرح شیروانی میں ملبوس بیٹھا پاتا ہوں۔ وہ مجھے یاد سمجھ کر نظرانداز کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کبھی اس کا کوئی آنسو بہہ کر کاغذ پر گر جاتا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اسے پونچھ دوں، لیکن سینے میں دھنسا تیر اور اس کے زخم سے رِستا خون اب بھی میرے جسم کی تمام سکت کھینچے ہوئے ہے اور میرے پاس اس کے لیے کاغذی مرہم کے سوا کچھ نہیں۔

لیکن میں سامنے والی دیوار پر لگی گھڑی کو پچھلے آدھے گھنٹے سے ٹک ٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں۔ کیوں کہ مجھے پتا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں کبھی میرے پاس نہیں ہوگی اسی لیے میں وقت کو اپنا دوست بنانا چاہتا ہوں جو کہ شاید ہر انسان ہی چاہتا ہے۔لیکن وقت تو یاد کا دوست ہے اور اس کی وقعت کو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھاتا رہتا ہے۔

اسی لیے اب میں اس کی یاد سے دوستی کر بیٹھا ہوں کیوں کہ صرف وہی ہے جو وقت سے لا پروا ہے۔اس وقت بھی یاد اس کے اس رات کے لال لباس میں میرے سامنے بیٹھی ہے۔اس نے بھی تمھاری طرح گھونگھٹ اوڑھا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کے چہرے پر گھبراہٹ نہیں ہوگی کیوں کہ اب وہ اور میں کئی عرصے سے یوں ہی ملاقات کر رہے ہیں۔اب تو اجنبیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔لیکن میں جب بھی اس سے ملتا ہوں اس کے کچھ نقش مزید ابھر جاتے ہیں اور کچھ بالکل غائب ہوجاتے ہیں۔

اس کے ہاتھوں پر لگی مہندی کا رنگ ہر ملاقات میں گہرا ہوتا چلا جاتا ہے اور مجھے کبھی کبھار خوف آتا ہے کہ وہ وہ کہیں ان پتیوں کی طرح سرخ نہ ہوجائے۔

فراز حسین
کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

کایا پلٹ

وہ کمرے میں کھڑکی کے ساتھ ساکت و جامد حالت میں صبح کے چڑھتے سورج پہ نظریں ٹکائے کھڑا تھا اور اس کا دماغ کسی اور ہی دنیا میں غوطہ زن تھا۔ کمرے کے درمیان پڑے ہوئے میز پر بڑا ایش ٹرے سگریٹوں سے بھرا پڑا تھا۔ سرخ آنکھوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ ساری رات جاگتا رہا ہے اور اس کا دماغ کسی اُدھیڑ بن میں رہا ہے۔ کمرے میں چل پھر کر ایک ایک چیز کو اچھی طرح دیکھ کے اب وہ آرام کرسی پر بیٹھ رہا۔ لمبی آہ بھر کر اس نے کرسی سے ٹیک لگائی اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ لگتا تھا کہ وہ اب کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

فرید محی الدین ایک کامیاب بزنس مین اور صنعت کار تھا۔ بیس کے لگ بھگ اس کی فیکٹریاں اور سینکڑوں ملازمین کا روزگار اس سے وابستہ تھا۔ انتہائی نا مساعد حالات سے اپنی جدو جہد کا آغاز کرنے والا فرید آج خدا کی مہربانی سے بزنس کی دنیا کا روشن ستارہ بن چکا تھا۔ ماں باپ کے گزر جانے کے بعد جس طرح کی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اس نے یہ سفر طے کیا وہ خود جانتا تھا یا اس کا رب۔ سال ہا سال کی محنتِ شاقہ سے آج وہ اس مقام پر ہے جہاں دنیا اسے رشک سے دیکھتی تھی۔

اس سفر کی مسافت میں اس نے گھر بھی بسایا۔ اللہ نے اچھی بیوی کے ساتھ اس کو اولاد کی دولت سے بھی مالا مال فرمایا۔ ہر طرف سے زندگی میں سکون تھا۔ بزنس، دولت اور اولاد، کسی بھی قسم کی کوئی پریشانی نہ تھی۔ کہتے ہیں جب ایسی صورت حال ہوتی ہے تو انسان میں کوئی نہ کوئی ایسی عادت پیدا ہو جاتی ہے جو اس کو تو باعثِ کوفت نہیں لگتی مگر دوسروں کی زندگی میں ضرور افراتفری یا بے چینی پیدا کر دیتی ہے۔ ایسی ہی عادت جو دوسروں کے لیے عدم اطمینان کا

باعث تھی۔فرید محی الدین کے لیے روزمرہ کی زندگی میں باعث طمانیت تھی۔کیا تھی وہ عادت؟ فرید ایک نفسیاتی مسئلے سے دوچار ہو چکا تھا کہ کوئی بھی اس کے ذاتی دفتر، گاڑی، گھر میں بھی اس کا ذاتی کمرا، کپڑے، جوتے یا ہر وہ چیز جو اس کے استعمال میں تھی حتیٰ کہ اس کے بیوی بچے بھی استعمال نہیں کر سکتے تھے۔یہ فرید کو کبھی بھی معیوب محسوس نہیں ہوا لیکن اس کی یہ عادت دوسروں کے لیے عدم اطمینان کا باعث تھی۔اس کو کبھی فرید نے محسوس ہی نہ کیا،اس کے لیے مختص تھی۔اس عادت میں پختگی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی تھی۔

فیکٹریوں کے دورے پر اس کی گاڑی میں صرف اس کا ڈرائیور ہوتا تھا۔ اس کا ذاتی عملہ دوسری گاڑی میں ساتھ ہوتا تھا۔مہمان بھی فیکٹری کی مختص کردہ گاڑی میں ہی آتے جاتے تھے۔کبھی مذاق میں بھی فرید نے صلح نہ ماری کہ وہ اس کے ساتھ سفر کریں۔دفتر کے استعمال میں بھی وہ از حد محتاط تھا۔اس کا عملہ ہائی الرٹ رہتا کہ کبھی بغیر اجازت کوئی ملازم بھول کر بھی دفتر میں داخل ہونے کی غلطی نہ کر بیٹھے۔گھر میں بھی فرید کا رویہ کچھ اسی طرح کا تھا۔کمرہ یا اس سے متعلق تمام اشیا بیڈ، آرام دہ کرسی یا کپڑے وغیرہ کوئی بھی گھر کا فرد اس کے علاوہ استعمال نہیں کرتا تھا۔دنیا جہان کی نعمتیں جو اس کو حاصل تھیں وہ دوسرے لوگوں کو مہیا کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا تھا۔بس اس کی ایک عادت کے علاوہ فرید میں کوئی دوسری کوتاہی نظر نہ آتی تھی۔

ایک دن فرید نے اپنے گھر والوں کو بتایا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں چند دنوں کے لیے ملک سے باہر جا رہا ہے۔اس نے اپنا سارا سفری شیڈول گھر والوں کو بتایا اور وہ پروگرام کے مطابق سفر پر رخصت ہو گیا۔چوں کہ اس نے تمام معاملات سے اپنے گھر والوں کو آگاہ کر دیا تھا اسی لیے گھر والے بھی مطمئن تھے۔ دِنوں کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ پروگرام کے مطابق دو دن بعد فرید کی واپسی تھی لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔فرید دو دن پہلے ہی واپس آ گیا۔ائیر پورٹ سے سیدھا وہ یہ سوچ کر گھر آیا کہ وہ سرپرائز دے گا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ جو وہ دیکھ رہا ہے کیا وہ سچ ہے۔اس سے پہلے اس کی آنکھوں نے یہ کبھی نہ دیکھا تھا۔وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی تھا کہ میری غیر موجودگی میں میرے گھر والے میرے ساتھ یہ بھی سلوک کر سکتے ہیں۔

اس کے کمرے کا نظام درہم برہم تھا اور اس کے بیڈ پر گھر میں آئے ہوئے مہمان سو رہے تھے اور اس کی

گاڑی لیے مہمان شاپنگ کو جا رہے تھے۔ فرید کے دل و دماغ میں غصے کی شدید لہر چل رہی تھی۔ وہ ایسی ہی حالت میں اپنے دفتر کب اور کیسے پہنچا یہ سب بعد کی باتیں تھیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے دفتر میں اسی کا بیٹا میز پر ٹانگیں پسارے بیٹھا ہے اور فرید کا ذاتی ڈرائیور اس کے دفتر کے اندر اس کے بیٹے سے رقم لے رہا ہے۔

فرید محی الدین نے جب غور سے دیکھا تو ڈرائیور کے تن پر زیب کیا ہوا سوٹ بھی فرید کا ہی تھا۔ جوں ہی، فرید دفتر میں داخل ہوا تو بیٹے اور ڈرائیور کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے جو اس نے دیکھ لیے تھے۔ ڈرائیور تو رقم لے کر جا چکا تھا، بیٹا بھی الرٹ ہو کر کھڑا ہو گیا اور بتانے لگا کہ ڈرائیور کی بیٹی کی شادی کی وجہ سے رقم اور سوٹ دیا تھا تا کہ اس کو کسی کوفت کا سامنا نہ کرنے پڑے۔ فرید کا دماغ اب غصے کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے اسی کش مکش میں گھر کو جانا ہی بہتر سمجھا، تا کہ اس سے زیادہ کچھ اور نہ دیکھ سکے۔ وہ کش مکش جو دماغ میں تھی گھر پہنچنے تک طوفان بن چکی تھی۔ وہ بولے جا رہا تھا اور اس کو خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بولے جا رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد اس کی بیوی نے جو بولا وہ ایک فقرہ اس پر پہاڑ بن کر گرا۔ بیوی نے کہا ''جب مر جاؤ گے تو کیا یہ سب سامان سینے پر رکھ کر ساتھ لے جاؤ گے؟'' بس یہ الفاظ سننے کی دیر تھی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر انڈیل دیا ہو۔ اس ایک زناٹے دار تھپڑ نے اس کی زندگی میں اُتھل پُتھل پیدا کر دی۔ اس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا۔

ساری رات وہ سوچتا رہا، کڑھتا رہا، جاگتا رہا۔ اس ایک فقرے نے اس کی کایا پلٹ دی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے گھر والے جو اس کی عادات سے واقف ہیں وہ یہ سب کر سکتے ہیں۔ اوپر سے بیوی کا طعنہ۔ فرید محی الدین کی دنیا بدل چکی تھی۔ ساری رات جاگ کر اس نے اپنی سوچوں کو مجتمع کرتے ہوئے اپنے گھر والوں کو فیصلے سے آگاہ کرنے کا پروگرام بنا کر اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے آنکھیں موند لیں۔

صبح معمول کے مطابق وہ اٹھا، دفتر جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو اس کو دیکھ کر بیوی بچوں کے حیرت زدہ چہرے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ فرید محی الدین مکمل بدلا ہوا انسان محسوس ہو رہا ہے۔ اب گھر والوں کی حیران و پریشان ہونے کی باری تھی۔ فرید نے انتہائی نرم لہجے میں گھر والوں کو بتایا کہ وہ ایک فیصلہ

سنانے والا ہے۔کل اور آج کے فرید میں زمین آسمان کا فرق نظر آ رہا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ چند ہی دن میں اس نے اپنے وکیل اور خاص دوستوں کے ذریعے اپنی تمام جائداد، فیکٹریاں، گھر (منقولہ اورغیر منقولہ) غرض تمام اثاثے فروخت کر دیے اور تمام سرمایہ یکجا کیا اور گھر والوں کو معقول حصّے منتقل کیے۔اب اس کی لگن کی رو اللہ کا گھر تعمیر کرنا تھا۔ چناں چہ اس نے شہر کے مضافات میں انتہائی شان دار زمین حاصل کی اور اس پر بہت ہی خوب صورت اور پُرشکوہ عمارت تعمیر کروائی اور اپنا ٹھکانا بھی اس نے مسجد میں ہی بنالیا اور خود کو اللہ کے گھر کا خادم مقرر کر لیا۔

فرید محی الدین نے باقی ماندہ تمام دولت خیراتی اداروں ،یتیم خانوں اور اولڈ ہاؤسز کی نذر کر دی۔ پانچ وقت کی اذان، نماز اور مسجد کی دیکھ بھال کی مصروفیت ہی اب اس کی زندگی تھی۔ وہ اکثر سوچتا کہ اگر یہ واقعہ اس کی زندگی میں رونما نہ ہوتا تو ابھی بھی وہ...............

سچ کہتے ہیں کہ جس کو اللہ کریم چن لیتا ہے اس کو اپنے لیے خاص کر لیتا ہے۔

محمد حارث

کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

ماسٹر مائنڈ

''میں نے کہا میں نہیں جانتا کہ یہ قتل کس نے کیا اور کب کیا۔''

''دیکھو، یہ معاملہ سنگین ہے اور تم بھی یہ جانتے ہو۔''

''میں ایک بزنس مین ہوں، میں کیا جانتا ہوں اور کیا نہیں اسے چھوڑو۔ البتہ یہ بتا دوں تمھیں کہ اگر اگلے پندرہ سیکنڈز میں تم میرے بنگلے سے باہر نہ گئے تو میرے باڈی گارڈز تمھیں بہت عزت کے ساتھ باہر نکال آئیں گے۔''

یہ سن کر مایوسی کے عالم میں پولیس آفیسر علی، سیٹھ کریم کے بنگلے سے باہر آ گیا ہے اور باہر آ کر موبائل پر کال ملائی۔

''نہیں۔ وہ اس قتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

فون کی دوسری طرف سے آواز آتی ہے۔ ''اس کا مطلب ہمارا کام آسان ہے۔ بس ٹھیک ہے جیسا تمھیں کہا گیا ہے ویسا ہی کرنا۔ پیسے تمھارے اکاؤنٹ میں ڈال دیے جائیں گے۔''

''میں سمجھ گیا آپ کی بات۔ بس پیسے ذرا پہلے آ جائیں۔''

''ہو جائے گا۔''

پولیس آفیسر علی اپنے سینئر آفیسر کے آگے حاضر ہوا ہے۔ ''سر آپ نے مجھے سیٹھ کریم سے اس مسئلے پر مشورے کے لیے بھیجا تھا مگر اس بار انھوں نے مدد کے لیے انکار کر دیا۔ مجھے کچھ شک ہے!''

سینئر آفیسر بولا ''شک! کیسا شک؟''

''آج تک بہت سے کیسز میں سیٹھ کریم نے ہماری مدد کی ہے اوران کیسز میں بھی کی ہے جن کا سیٹھ کریم سے دُور دُور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔''

''تو؟'' سینئر آفیسر بولا۔

''میرا مطلب ہے اس بار وہ شاید کچھ چھپا رہے ہیں۔ جو شخص قتل ہوا وہ انھی کی فیکٹری کا بندہ تھا اوراس کی بنتی بھی نہیں تھی سیٹھ کریم سے۔''

سینئر آفیسر: ''میں سمجھ رہا ہوں، مگر جانتے ہو نا کہ وہ بہت پاورفُل بندہ ہے، اس کے تعلقات بڑی بڑی ایجنسیوں کے ساتھ ہیں۔''

''جی جانتا ہوں۔''

اتنی دیر میں سیٹھ کریم اپنے ایک باڈی گارڈ کے ساتھ سینئر آفیسر کے کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ قتل تم نے کیا ہے علی!''

''میں نے! تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو اور یہ جرأت کیسے کی۔''

اتنی دیر میں سیٹھ کریم نے اپنے موبائل پر ایک ویڈیو آن کر کے سینئر آفیسر کے سامنے رکھی جس میں آفیسر علی موبائل پر سیٹھ کریم کو جھوٹے کیس میں پھنسانے کی بات کر رہا تھا۔

یہ دیکھ کر علی حیران اور پریشان ہوا اور خوف زدہ ہو کر بولا ''میری اس شخص سے بات ضرور ہوئی مگر میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اور نہ ہی قتل میں نے کیا ہے۔ ہاں اس اس کی ذمہ داری مَیں سیٹھ کریم پر ڈالنا چاہتا تھا تا کہ مجھے پیسے مل سکیں۔''

سیٹھ کریم بولا! ''جناب! ثبوت آپ کے سامنے ہے اور قاتل بھی، البتہ اس کیس کا ماسٹر مائنڈ ابھی پکڑنا باقی ہے۔''

سینئر آفیسر بولا ''پریشان نہ ہوں اس کو بھی پکڑ لیں گے۔''

سینئر آفیسر نے علی کو جیل میں ڈلوا دیا اور جیل کی سلاخوں میں کافی سوچ بچار کے بعد اس کو اندازہ ہوا کہ ماسٹر مائنڈ کون تھا۔

محمد عبداللہ ظفر
کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

سچّا پیار

پورا دن میں اپنی معمولی سی نوکری پر گزارنے کے بعد جب پبلک ٹرانسپورٹ کے دھکے کھا کر بالآخر اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچا تو رحیم کو وہاں کھڑے پایا۔ اُسے دیکھ کر میں عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا کیوں کہ جہاں وہ سال ہا سال سے میرا اچھا دوست رہا تھا، وہیں اُس کے دیے دھوکے کا زخم اب تک تازہ تھا، اس بات کا اندازہ مجھے اُس لمحے ہوا۔ اس بات کو دس برس گزر چکے تھے۔ اُن دس سالوں میں مَیں نے سوشل میڈیا پر تو اُسے اپنی بہترین زندگی گزارتے بارہا دیکھا ہو گا، یہ پہلی مرتبہ تھا کہ ان دس برسوں میں مَیں نے اُسے حقیقت میں اپنے سامنے کھڑے پایا۔ عین اُسی جگہ جہاں ہماری آخری ملاقات ہوئی تھی۔

ابھی میں اسی کش مکش میں تھا کہ کیا کروں کہ اُس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ وہاں سے بھاگتا ہوا مجھ سے آن لپٹا اور زاروقطار رونے لگا۔ اُس کا دھوکا اپنی جگہ، میرے دل میں ابھی بھی اُس کے لیے نرم گوشہ موجود تھا۔ میں نے اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور اسے اسی طرح روتے ہوئے اندر لے آیا۔ اگر وہ رونے میں مصروف نہ ہوتا تو شاید اندر بھی نہ آتا۔ اُسے میرے اپارٹمنٹ سے نفرت تھی اور میرے اپارٹمنٹ میں اُسے گھٹن محسوس ہوا کرتی تھی۔ مگر آج وہ کچھ نہ بولا۔ بس کرسی پر بیٹھا سسکیاں لیتا رہا۔ میرے کندھے پر موجود آنسوؤں کی نمی اب تک موجود تھی اور میرا دماغ سوالات سے بھرا ہوا تھا۔ پانی کا گلاس اسے تھماتے ہوئے میں نے پہلی دفعہ مٹی سے اَٹے اس کے کپڑے اور بڑھی ہوئی شیو کی طرف دھیان دیا۔

’’مجھے معلوم ہے کہ میں نے تمھارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے اور ان سب سالوں کے گزر جانے کے

باوجود اپنے کیے پر ندامت کا اظہار نہیں کر سکا'' اس نے بالآخر خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

''معافی مانگنے کا اچھا انداز ہے'' میں دھیمے لہجے میں بولا۔

''امید ہے کہ تمھاری زندگی اچھی چل رہی ہے کیوں کہ میری زندگی تباہ و برباد ہو چکی ہے، ان دس برسوں میں نہ جانے کیسے ہر صبح مجھ میں اُٹھ کر کام پر جانے کی ہمت آئی ہے۔ مَیں بس خودکشی کر لینا چاہتا تھا'' میری بات سن کر اس کا سر جھکتا چلا گیا۔

''وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی، میں سب کچھ کھو بیٹھا ہوں'' وہ بولا۔ مجھے اس بات کا بالکل اندازہ نہ تھا کیوں کہ شاید میں اپنی انتہائی نارمل زندگی گزارنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

آمنہ کا ذکر سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں ہر روز اس کے بارے میں سوچتا تھا۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ چاہتے ہوئے بھی میں خود کو ملنے والے دھوکے کا ذمہ دار اُس کو نہیں بلکہ صرف اور صرف رحیم کو ہی سمجھتا تھا۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، یہ میں جانتا تھا، مگر میرے دل میں آمنہ کا پیار ابھی بھی موجود تھا۔ کالج کے دنوں میں ہم تینوں بہت اچھے دوست ہوا کرتے تھے اور میں اور آمنہ ہمیشہ سے ہی ایک دوسرے کو بہت پسند تھے۔ رحیم کو شاید میری اور آمنہ کی سمندر کنارے لمبی سیر زیادہ پسند نہ تھی۔ دس برس پہلے نہ جانے اُس نے کیا خواب دکھا کر آمنہ کو مجھ سے دور کر دیا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ آمنہ نے ایک دم مجھ سے بات کرنا کیوں چھوڑ دی تھی۔ پھر مجھے رحیم اور آمنہ کی شادی کا کارڈ موصول ہوا۔

''مگر کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں یار''

اس نے مجھے اپنے باپ کے مرنے کی خبر دی، اکلوتا بیٹا ہونے کے ناطے سب کچھ اُس کے نام ہو گیا تھا، جو اس نے آمنہ کا پیار حاصل کرنے کی خاطر اُسے برسوں پہلے ہی آہستہ آہستہ کر کے دے دیا تھا۔

''پوری زندگی میں بس وہ پیار، اُس قسم کا جذبہ آمنہ سے چاہتا تھا جو تم دونوں کے درمیان تھا'' وہ بولا۔

''اور تمھارا خیال تھا کہ پیار بکاؤ چیز ہے کہ تم اُسے اپنے پیسے اور جائدادوں سے خرید لو گے؟'' میرے یہ

کہنے پر وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

''تمھیں شرم آنی چاہیے، تمھاری ہمت بھی کیسے ہوئی آج یہاں آنے کی؟'' یہ کہتا ہوا میں فون کی جانب بڑھا۔

''ہیلو؟'' آگے سے کوئی نہ بولا۔ چند مرتبہ ہیلو کہنے کے بعد میں نے فون رکھ دیا۔ میرے واپس آنے پر رحیم کمرے میں موجود نہ تھا۔ کچن سے برتنوں کی آواز آنے پر میں نے وہاں کا رخ کیا اور دروازے میں ہی کھڑا اُسے بریڈ پر جام لگاتے اور دودھ کا ایک گلاس تیار کرتے دیکھنے لگا۔

''سوری'' میں نے دو دن سے کچھ کھایا نہیں ہے'' وہ بولا۔

میں نے جواب نہ دینا مناسب سمجھا اور چپ کر کے کمرے میں دوبارہ آن بیٹھا اور اپنا موبائل چیک کرنے لگا۔ ایک انجان نمبر سے چند منٹ پہلے مجھے ایک SMS بھیجا گیا تھا۔ ''You there?'' بس یہی لکھا تھا۔ میں نے ''Who is this?'' کا میسج بھیج کر رحیم کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے فون واپس جیب میں رکھ لیا۔

''تمھاری اس حرکت کے بعد میری زندگی ساکت ہو کر رہ گئی ہے۔ جیسے تیسے کر کے میں نے اپنے لیے دو ٹکے کا کام ڈھونڈا ہے کہ پیٹ پلتا رہے'' میں نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولا۔

میری بات ان سُنی کر کے وہ بولا ''میں اپنی ماں کے لیے تمھاری فریج میں سے تھوڑا کھانا لے جاؤں؟ وہ بھوکی ہو گی۔'' اُسے بھی بس اپنے کام سے کام تھا۔ ابھی تک اُس نے نہ تو مجھ سے معافی مانگی تھی اور نہ ہی ندامت کا اظہار کیا تھا۔ مجھے غصے سے اپنا خون گرم ہوتا ہوا محسوس ہوا مگر میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے روکھا سا ''Sure'' کہہ دیا۔

وہ میرے نزدیک آ بیٹھا۔ ''کیا تم آمنہ کو ڈھونڈنے میں میری مدد کرو گے؟'' اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر مجھے اپنی قوتِ سماعت پر ذرا شک ہوا۔

''واقعی؟ یہ وجہ ہے کہ تم یہاں آئے ہو؟ دس برس بعد، سب کچھ ہو جانے کے بعد تمھارا خیال ہے کہ

میں تمھاری مدد کروں گا؟'' میں نے طیش میں آتے ہوئے بولا۔ ''اٹھو،نکلوں یہاں سے،تم کسی قابل نہیں ہو'' میں نے اٹھ کراُسے بازو سے پکڑا اور دھکے دیتا ہوا دروازے کی طرف لے جانے لگا۔اُس نے ذرا بھی Resist نہ کیا جیسے وہ ساری امیدیں کھو بیٹھا ہو۔اُسے دروازے سے باہر نکالتے ہوئے میں بولا:''دوبارہ اپنی شکل نہ دکھانا''۔

میں واپس آکر اپنے کمرے میں جا لیٹا۔اُسی وقت دوبارہ اجنبی نمبر سے میسج موصول ہوا۔

''آمنہ۔مجھے ساحل پر آج ملو،تم تو غائب ہی ہو گئے ہو۔تمھاری زندگی سے ایک بُرا دوست نکالنے کا شکریہ وہیں وصول کروں گی۔''

رمیزہ رضوی

کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

اے کاش۔۔۔

وہ ستمبر کی ایک عام سی شام تھی۔ ہر جگہ خاموشی اور سکوت چھایا ہوا تھا، سوائے خالد صاحب کے گھر کے جہاں آہوں، چیخوں اور سسکیوں کا ایک طوفان برپا تھا۔ اپنے سترہ سالہ جوان بیٹے کی میت کو کاندھا دیے خالد صاحب بوجھل دل کے ساتھ قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔ اٹھنے والا ہر قدم ان کے اعصاب پر بجلی بن کر گر رہا تھا۔ آج وہ اپنے جگر گوشے کو منوں مٹی تلے دفنانے والے تھے۔ عثمان کو قبر میں اتارنے کے بعد تو خالد صاحب کی ہمت جواب ہی دے گئی۔ مٹی کی آخری مٹھی ڈالتے ہوئے ان کے ہاتھ بری طرح کانپنے لگے۔ وہاں موجود سب لوگوں نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

اپنے چھوٹے بیٹے کو اس کی آخری منزل پر پہنچا کر خالد صاحب گھر کی طرف روانہ ہوئے تو ان کے ذہن میں بہت سے خیالات نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ بچپن سے اب تک کی عثمان سے وابستہ ساری یادیں ان کے ذہن کے پردے پر ایک فلم کی صورت چلنے لگیں۔ عثمان کا بڑا بھائی حنان جو ہمیشہ سے ان کی توجہ کا مرکز رہا تھا، اپنے چھوٹے بھائی کی موت پر بھی پاکستان نہ پہنچ پایا۔ آتا بھی کیسے؟ وہ تو ان کی دلی خواہش کو پورا کرنے کے لیے امریکا کی بہترین یونی ورسٹی میں میڈیسن کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اسے اب پاکستان لوٹنے کی فرصت کہاں تھی۔

گھر پہنچ کر خالد صاحب کا سامنا بیوی کی شکوہ کرتی نگاہوں سے ہوا۔ وہ ان کو اپنے چھوٹے بیٹے کی موت کا مجرم سمجھتی تھی۔ اگرچہ مریم نے ان سے کبھی بھی عثمان سے رکھے گئے سخت اور جارحانہ رویے کی شکایت نہ کی تھی۔ اکثر مار پیٹ کیے جانے پر شکوہ اور احتجاج نہیں کیا تھا مگر اس کی خاموش نظریں انھیں بہت کچھ کہہ دیتی تھیں۔ دن اسی طرح خاموشی سے

گزرتے جارہے تھے۔عثمان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد گھر میں اداسی نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔

ایک دن خالد صاحب نے کچھ سوچ کر عثمان کے کمرے کا رخ کیا۔کمرے کا دروازہ کھولنے سے پہلے تھوڑا رکے اور پھر ایک لمبی سانس لے کر اندر داخل ہوگئے۔عثمان کی چیزیں ابھی بھی اسی طرح جگہ جگہ فرش، بستر اور صوفے پر بکھری پڑی تھیں مگر آج انھیں کمرے کی بے ترتیبی پر قطعاً غصہ نہیں آیا۔اچانک ان کی نگاہ سائیڈ ٹیبل پر پڑی ہوئی ایک سیاہ رنگ کی ڈائری پر پڑی۔انھوں نے کانپتے ہاتھوں سے ڈائری کو تھاما اور عثمان کے بستر پر بیٹھ گئے۔ڈائری کے پہلے چند صفحات پر عثمان کی بچپن کی تصویریں، اس کی بنائی گئی ڈرائنگ کے نمونے، اخباروں میں چھپی ہوئی اس کی انگریزی نظموں اور کہانیوں کے تراشے چسپاں تھے جنھیں پڑھتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔وہ بڑے پیار اور احتیاط سے ان تحریروں کو اپنے ہاتھوں سے چھونے لگے۔

ڈائری کے مزید اوراق پلٹے تو انھیں اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رہا۔ڈائری میں تحریر کیا ہوا ہر لفظ چیخ چیخ کر ان سے شکوہ کر رہا تھا کہ ''بابا آپ مجھ سے پیار کیوں نہیں کرتے؟ آپ میری بات کیوں نہیں سنتے؟ کیا میں آپ کی سگی اولاد نہیں؟ آپ ہمیشہ بڑے بھائی کا ساتھ ہی کیوں دیتے ہیں۔؟ بابا مجھے انجینئر نہیں بننا، مجھے انگلش لٹریچر اچھا لگتا ہے۔بابا مجھے رنگوں سے کھیلنا پسند ہے۔آپ دیکھیے گا ایک دن آئے گا جب لوگ میری کتابیں پڑھا کریں گے، میری نظموں کی تعریفیں کریں گے۔'' عثمان کا ہر شکوہ اور ہر معصوم التجا ہتھوڑے کی طرح ان کے اعصاب پر چوٹ لگا رہی تھی۔صحیح ہی تو لکھا تھا اس نے یہ سب۔بچپن سے لے کر آج تک میں عثمان کے ساتھ ہمیشہ ہی سختی سے پیش آتا رہا ہوں۔چھوٹی سے چھوٹی بات پر میں اس ننھی سی جان پر ہاتھ اٹھا دیتا اور بُرا بھلا کہتا رہا، صرف اس لیے کہ اسے میری خواہش کا احترام نہیں تھا۔میں اسے ہر حال میں انجینئر دیکھنا چاہتا تھا۔عثمان، حنان کے مقابلے میں تعلیمی لحاظ سے تھوڑا کمزور تھا اور یہی بات مجھے اس پر تشدد کرنے پر مجبور کر دیتی تھی اور جب کبھی اس کی ماں میرے اور اس کے بیچ میں آجاتی تو میں اس پر بھی ہاتھ اٹھانے سے نہیں چُوکتا تھا۔

جیسے جیسے وہ ڈائری کے اوراق پلٹتے گئے، ویسے ویسے انھیں اپنی کوتاہیوں اور زیادتیوں کا شدت سے احساس ہونے لگا، ڈائری کا ہر ورق شکوہ کناں تھا۔

اگر میں نے اس سے نرمی اور پیار کا برتاؤ کیا ہوتا اور اس کی بات مان کر اس کی خوشی پوری کرنے کی اجازت دے دی ہوتی تو آج میرا بیٹا زندہ ہوتا۔ کاش!

ایک بار پھر عثمان کی خودکشی سے پہلے ہونے والی ان دونوں کی آپس کی بحث و تکرار کا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اس روز بھی ناشتے کی میز پر اس کے گیارہویں جماعت کے خراب نتیجے کی رپورٹ پر دستخط کرتے ہوئے انھوں نے حسبِ معمول برا بھلا کہا، اسے نالائقی کے طعنے دیے اور بڑے بھائی کی لیاقت و ذہانت کی مثالیں دیتے ہوئے اس کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی تھی۔

شام کو دوبارہ دونوں باپ بیٹے کی اسی موضوع پر طویل بحث و تکرار کے بعد عثمان حسبِ معمول اپنے کمرے میں سونے چلا گیا۔ اگلی صبح دفتر جانے سے پہلے ناشتے کی میز پر عثمان کی غیر موجودگی پر خالد صاحب نے اپنی بیوی کو اسے بلانے کو کہا اور اخبار کی ورق گردانی کرنے لگے۔ اچانک انھیں اپنی بیوی کی چیخیں سنائی دیں اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر عثمان کے کمرے کی طرف بڑھے۔ یہ کیا۔۔۔ عثمان کی لاش چھت سے لگے ہوئے پنکھے سے جھول رہی تھی اور ان کی بیوی فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔

انھیں یاد آ رہا تھا کہ کیسے حنان ہر وقت کتابی کیڑا بنا رہتا تھا اور عثمان ان کے لاکھ منع کرنے کے باوجود سکول سے آتے ہی چھت پر چڑھ کر پتنگ بازی کرنے چلا جاتا یا پھر محلے بھر کے لڑکوں کو اکٹھا کر کے کرکٹ کھیلنے لگ جاتا۔ عثمان کی یہی حرکتیں انھیں غصہ دلاتی تھیں اور وہ اس پر مزید تشدد اور سختی کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ انھیں سمجھ نہیں آتا تھا کہ سکول جانے اور گھر پر ٹیوشن کے انتظام کے باوجود عثمان ریاضی اور سائنس کے مضامین میں اس قدر کمزور اور کند ذہن کیوں تھا۔ اس کی اس کمزوری کا فائدہ اس کا بڑا بھائی خوب اٹھاتا اور اس کی جائز، ناجائز شکایات کر کے باپ سے اس کو ہر دوسرے دن پٹواتا رہتا۔ اس کے اساتذہ بھی اس کے نکمے پن سے تنگ آئے ہوئے تھے اور ہر مرتبہ امتحان کے نتیجے کے بعد جب بھی خالد صاحب کو اس کی تفصیلی رپورٹ دینے کے لیے بلوایا جاتا تو خالد صاحب کا دل کرتا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔

مگر اب یہ سب بے کار اور بے سود تھا۔ خالد صاحب کا ضمیر انھیں ملامت کر رہا تھا اور وہ اپنے آپ سے بھی

نظریں نہیں ملا پا رہے تھے۔عثمان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد خالد صاحب کے دامن میں سوائے پچھتاوے اور افسوس کے کچھ نہ بچا تھا۔

''کاش میں نے اپنے چھوٹے بیٹے کو بھی اتنی ہی توجہ اور پیار دیا ہوتا جتنا بڑے کو دیتا تھا۔میں ایک بار۔۔۔ ہاں صرف ایک بار اس کو گلے لگا کر اس کی خواہش کو جان لیتا۔بجائے سختی اور مار پیٹ کرنے کے، اس کو بھی حنان کی طرح حوصلہ اور اعتماد دیا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔''

''کاش! اے کاش۔۔۔۔۔''

مبشرہ اشرف
کریٹو رائٹنگ ان اردو اینڈ پنجابی

راضی

ابو ابو، رمضان کا چاند نظر آ گیا۔علی کی گیارہ سالہ بیٹی اور تیرہ سالہ بیٹا خوشی سے اچھل رہے تھے۔اولاد سب کو پیاری ہوتی ہے۔علی نے بھی بیٹی کو پیار کیا۔''ابو میں بھی روزہ رکھوں گی'' جیسی باتیں چلنے لگی۔علی نے بیٹی کو روک دینا چاہا کیوں کہ وہ چھوٹی تھی۔مگر بیٹی کے اصرار پر زیادہ دیر منع نہ کر سکا۔بیٹی خوشی سے جھوم اٹھی اور علی کو زور سے گال پر بوسہ دیا۔

''ابو ہم روزہ کیوں رکھتے ہیں؟ رمضان کا اتنا انتظار کیوں؟'' بیٹا بولا۔

''بیٹا رمضان برکتوں کا مہینہ ہے۔اس میں مسلمان روزے رکھ کر اللہ کو راضی کرتے ہیں۔''

''اچھا پاپا۔کل پھل پکوڑے لانے ہیں، اب ہم سوتے ہیں، صبح سحری بھی کرنی ہے۔''

اگلے دن پہلا روزہ تھا۔گھر میں بوڑھی ماں کے علاوہ سب کا روزہ تھا۔علی آفس سے بھی جلدی واپس آ چکا تھا۔اس کے آتے ہی بچوں نے شور برپا کر دیا۔علی بچوں کے ساتھ پھل اور سموسے پکوڑے لے آیا۔

''پاپا، دادی امّاں کے لیے ملک شیک بنائیں نا۔'' بیٹا بولا۔

''کوئی ضرورت نہیں۔روزہ نہیں رکھا انھوں نے۔'' علی کی بیوی نے منھ بسورتے ہوئے کہا۔

''تم نے صبح کھانا دیا تھا امّی کو؟''

''نہیں! روزے تھے سب کے، کھانا نہیں بنایا۔''

علی بیوی کے رویے سے بے حد پریشان تھا مگر کچھ بول نہ سکا کیوں کہ بچے دیکھ رہے تھے۔

''پاپا میں دادی کو پھل دے کر آیا'' بیٹا بولا۔

''کوئی ضرورت نہیں، میں دے آتی ہوں۔'' علی کی بیوی غصے سے ایک کیلا اور سیب کمرے میں لے گئی۔

''یہ لو بڑھیا، عمر نہیں تمھاری پھل کھانے کی۔ میرے میاں اور بچوں پر عذاب بنی ہو۔''

دادی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جیسے برف پگھل رہی ہو۔

رمضان کا پہلا عشرہ گزر چکا تھا۔ علی اپنے آفس میں تھا جب اُس کے فون کی گھنٹی بجی۔ فون سنتے ہی وہ گاڑی کی طرف بھاگا۔ گھر پہنچا تو بیٹا روتا ہوا علی کو بتا رہا تھا کہ دادی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ وہ کچھ بول بھی نہیں رہی تھیں۔ دادی کو جلدی سے اٹھا کر گاڑی میں منتقل کیا گیا۔ ہسپتال پہنچتے ہی دادی کو ایمرجنسی میں لے گئے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر آیا اور علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا:

''سوری! خوراک کی کمی کی وجہ سے آپ کی والدہ اب نہیں رہیں۔''

علی کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔ مغفرت کے عشرے میں وہ خود کو اپنی ماں کی وفات کا مجرم سمجھ رہا تھا۔ وہ زور زور سے رونے لگا۔ والدہ کو دفن کر کے وہ گھر واپس آیا، بچے اس سے لپٹ کر رونے لگے۔

''پاپا، دادی ہمیں کیوں چھوڑ کر چلی گئی؟ کل مجھ سے کہہ رہی تھی، بچو! معاف کرنا تمھارے لیے عذاب ہوں۔ پاپا، دادی کو جو پھل ہم دیتے تھے وہ ہمیں کھلا دیتی تھیں'' بیٹی بولی۔

''پاپا، دادی نے تو روزے بھی نہیں رکھے۔ وہ چلی گئیں۔ دادی نے اللہ کو راضی نہیں کرنا تھا؟'' بیٹا پوچھنے لگا۔

''بیٹا دادی اماں نے اللہ کو راضی کر لیا ہے۔ ہم اللہ کو راضی نہ کر سکے۔'' علی کی آنکھیں حسرت و ندامت کے آنسوؤں سے نم تھیں۔ ''راضی کرنے کی بجائے الٹا ناراض کر لیا۔'' مگر اب وقت گزر گیا۔ رونے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

فرحان سلیم

پہلی نظر کا پیار

تب میں پانچویں جماعت میں تھا اور ریاضی کے استاد شکور صاحب نے مجھے کلاس کے باہر مرغا بنایا ہوا تھا۔ شکور صاحب عجیب سزائیں دیتے تھے۔ مرغا بنا کر دروازے میں اس طرح کھڑا کرتے کہ نظریں کلاس سے باہر رہیں اور باقی کلاس کے لیے عبرت کا سامان ہوتا رہے۔ خود بھی پڑھاتے ہوئے پوری کلاس کا چکر لگا کر آتے اور کمر پر ایک چھڑی رسید کر دیتے۔ میں ایک سیدھا سادھا طالب علم تھا۔ پڑھنے سے بھاگتا تھا لیکن نہ جانے کیسے کلاس میں فرسٹ آجاتا۔ اسی وجہ سے کئی ہم جماعت مجھ سے جلنے لگے تھے اور اکثر وہ تعویذ مانگتے جس سے مَیں اول آتا تھا۔ تعویذ تو کوئی نہیں تھا۔ سارا سال رسالے اور کہانیاں پڑھنے میں گزر جاتا۔ امتحان سے پہلے بیس دن ایمان داری سے صبح کی نماز سے شام کی نماز تک خوب انہماک سے چھت پر دیوار سے ٹیک لگا کر پڑھا کرتا۔ صبح سویرے حافظہ بھی خوب ساتھ دیتا۔

اس دن بہرحال میرا کوئی قصور نہ تھا۔ سبق بھی یاد تھا۔ میرے ساتھ بیٹھے لڑکے نے مجھ سے پنسل مانگی۔ جب اس نے شکور صاحب کو آتے دیکھا تو فوراً اپنے ڈیسک کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ مجھے کلاس کا سکون غارت کرنے کا مرتکب ٹھہرایا گیا اور اسی جرم کی پاداش میں مرغا بننے کی سزا سنائی گئی۔ مَیں مرغا بنے کمرے کے دروازے سے باہر ہوا سے ہلتے پتوں کا نظارہ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ماسٹر جی کے قدموں سے اندازہ لگا رہا تھا کہ اگلا وار کب ہوگا۔ اچانک ایک مدھر اور سُریلی سی آواز میرے کانوں میں پڑی، ’’ذرا رستہ دینا۔‘‘

دیکھا تو دو حسین پاؤں میرے سامنے تھے۔ میں اسی حالت میں کھسک کر دروازے کی طرف ہو گیا اور وہ

خوب رولڑکی کلاس میں داخل ہوگئی۔ میں بھی کان چھوڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ پہلی ملاقات بھی بڑی عجیب تھی۔'لَو ایٹ فرسٹ سائیٹ' شاید اسی کو کہتے ہیں۔ وہ مجھے دیکھ کر سہم سی گئی۔ ماسٹر جی کا خوف شاید اُس پر بھی طاری ہو گیا تھا۔ وہ اسکول میں اس کا پہلا دن تھا۔ میرے ذہن میں ایک سوال تھا لیکن اس سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس دن سے آٹھویں جماعت میں پاس ہونے تک میں ہر روز اسے اِمپریس کرنے کی کوشش میں رہتا لیکن مجھے احساس ہوا کہ میرے ہر بار اول آنے سے اسے مجھ پر غصہ آتا ہے۔ وہ خود بھی خاصی ذہین تھی۔ آخر آٹھویں کے امتحان ہو گئے اور میں نے جان بوجھ کر کئی سوال چھوڑ دیے اور وہ اول آ گئی۔ میں بہ مشکل پاس ہو سکا۔ رزلٹ کے دن اس کی خوشی قابلِ دید تھی، بعض دفعہ ہار جانا بھی کتنا خوب صورت لگتا ہے! اس کے بعد ہائی سکول اور پھر کالج میں داخلہ ہو گیا۔ کالج کے بعد بھی میں اس کے کالج کے قریب والی دکان پر نمکو کھانے کے لیے چلا جاتا، جہاں سے وہ کالج سے باہر نکلتی نظر آتی۔

میری خاموش محبت کے ساتھ وقت بھی پر لگا کر اُڑتا رہا اور پھر وہ شہر چھوڑ گئی۔ اس کے بعد میری اس سے ملاقات چھبیس سال کی عمر میں ہوئی جب کرکٹ کھیلتے ہوئے میں ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہوا اور مجھے ہسپتال لے جایا گیا۔ وہ ہسپتال میں ایک ڈاکٹر کے روپ میں اپنے سینئر ڈاکٹر کے ساتھ مجھے اٹینڈ کرنے آئی۔ اُسے دیکھ کر میرے ہونٹ خشک ہو گئے اور وہی سوال پھر میرے ذہن میں آیا، جو اٹھارہ سال سے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہ ہوتی تھی۔ اُس سے باتوں باتوں میں پتا چلا کہ چند دن بعد اس کی شادی ہے۔ یہ خبر سن کر مجھے کوئی خاص فرق نہ پڑا، شاید ایک عرصے بعد جذبات اتنے مدھم ہو جاتے ہیں کہ کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رابطوں میں کمی اکثر رشتوں کو مار دیتی ہے۔ شاید محبتوں کو بھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا لیکن ایک بے نام سا سوال باقی تھا۔

زندگی پَر لگا کر اُڑتی گئی، عملی زندگی نے بڑھاپے کی طرف دھکیل دیا تھا۔ کاروباری معاملات کی بھاگ دوڑ میں محسوس ہی نہ ہوا کہ کب چالیس برس کا ہو گیا۔ وہ کہیں خیال و گمان میں بھی نہ تھی۔ ہاتھ میں دفتری کاغذات کی ایک فائل تھی اور اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ خیال میں دن کی باقی ملاقاتیں تھیں کہ کہیں سے سر میں ایک سلاخ لگی اور میں نیم بے ہوشی کے عالم میں گر پڑا۔ دو یا شاید تین راہ گیروں نے ایمبولینس کو بلایا اور مجھے اس میں ہسپتال بھیجا۔

ہوش آیا تو میں لاہور کے کسی ہسپتال میں تھا، سر پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا اور دھندلی آنکھوں کے سامنے کوئی

چٹکیاں بجاتا ہوا ''سر، سر'' کہہ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں زور سے بند کر کے کھولیں تو وہی چہرہ سامنے تھا۔ چہرے پر عمر کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ وہ مجھے پہچان گئی۔ چار پانچ دنوں میں میری پٹیاں کھل گئیں، ٹانکوں کے نشان رہ گئے تھے۔ میں ڈاکٹر صاحبہ کے دفتر میں بیٹھا اُن کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔لیکن آنکھوں میں وہی سوال تھا جو پانچویں جماعت سے ہی میرے اور اس کے درمیان دیوار بن کر کھڑا تھا۔ یہ سن کر افسوس ہوا کہ شادی کے دو سال بعد ہی اُسے طلاق لینے کی نوبت آ گئی تھی۔ اس کے بعد اُس نے شادی نہیں کی اور لاہور کے اس نجی ہسپتال میں نوکری شروع کر دی۔ رخصت لے کر میں مڑا ہی تھا کہ اُس کی آواز نے میرے قدم روک لیے۔

''حماد۔۔۔''

میں نے گردن گھما کر اُسے دیکھا، وہ مسکرا رہی تھی۔

''حماد کیا میں پوچھ سکتی ہوں، وہ کون سا سوال ہے جو ہمیشہ تمھاری آنکھوں میں مجھے نظر آتا ہے؟''

میں نے خالی خالی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور واپس مڑ کر جانے ہی لگا تھا کہ پھر اُس کی آواز آئی۔

''آج پوچھ لو۔۔۔ زندگی بار بار ملاقات نہیں کرواتی۔''

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اُسے مڑ کر دیکھا اور ٹیبل پر ہاتھ رکھ کر بولا: ''صرف ایک سوال تھا۔۔۔''

اس کے آگے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اپنا فون اٹھایا اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔

راز احتشام

گلوبل وارمنگ

گلوبل وارمنگ تیرے ہمیشہ غصے میں رہنے کے باعث بڑھ رہی ہے
تو ایمازون کے جنگل میں ہر اک سبز شے کی آخری توجیہ
تو منطق کے اصولوں کی شکست وریخت کا باعث
ترے جلتے ہوئے رخسار سے برفیلے کہساروں پہ پھیلی برف پانی ہورہی ہے
یہ دنیا ناسمجھ ہے اور ناواقف کہ تیرے آنسو اس کو کس قدر مہنگے پڑیں گے

یہ آفاقی مسائل، قحط، جنگیں۔۔۔۔اور دیگر بے تحاشا غیر آفاقی مسائل
تری بدلی ہوئی نظروں کے باعث ہیں
تری یہ غیر جانبداریت کتنی ہی دہشت گرد تنظیموں کی پروردہ بنی ہے
تری آنکھوں نے کتنی عالمی جنگوں کی راہ ہموار کر دی ہے

یہ آبی، معدنی قلت ترے دو آنسوؤں کے رائگاں ہونے کے خمیازے سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے
سیہ ہول اب بھی کوشش کر رہے ہیں تیری آنکھوں میں سما جائیں
تو پتھر کے زمانے میں بھی تہذیبوں کے پتھر دل سلاطیں کے دلوں پر راج کرتی تھی

تجھے تکتے ہی سارے چور اُچکے اپنا سب کچھ یوں لٹا بیٹھے
کہ اب ان رہزنوں کی روزی روٹی تیری تصویریں دکھا کر لوٹ لینے سے جڑی ہے

پسینے میں ترے جلتے بدن نے یہ بتایا؛ آگ اور پانی کی یکجائی بھی ممکن ہے
یہ سارے کیمیا داں آفرینش سے تری خوشبو کے در پے ہیں
کئی لوگوں نے تیری نقل کر کے کہکشاؤں کی طرف مصنوعی سیارے بھی بھیجے
مگر یہ کام تو تیری ہنسی اب تک بخوبی کر رہی تھی
کروڑوں ایلین دنیا میں بس تیری ہنسی سننے تو آئے ہیں

مگر یہ نظم ادھوری ہے، اور اس میں دن بدن اتنا اضافہ ہو رہا ہے
کہ آنے والے وقتوں میں تری آنکھیں طبیعاتی اصولوں میں یوں استثنیٰ نکالیں گی

کہ تجھ پر مرنے والوں میں کئی روبوٹ بھی ہوں گے!

راز احتشام

نظم

میں خواب لکھتا ہوں
منتشر خواب۔۔!
مجھ کو لگتا ہے دور۔۔سیاروں اور ستاروں کے آس پاس
ایک بستی ہے
جس کے رہنے والے
ہمارے خوابوں کے راستے سے کلام کرتے ہیں!

مجھ کو لگتا ہے خواب دنیا کو ایس او ایس (SOS) ہیں
کوئی مصیبت میں اپنی جانب پکارتا ہے
دہائی دیتا ہے
اور یہ بے ربط، گنجلک، منتشر، زماں اور مکاں سے آزاد خواب دراصل عندیہ ہیں
کہ بستی والوں نے وقت سے چھیڑ چھاڑ کی
اور وقت نے انتقام میں
ان سے ساری ترتیب چھین لی ہے!

اور اب وہ زنجیر توڑنے پر ملال کرتے ہیں، بین کرتے ہیں
ان کی دنیا کسی چکرویو میں پھنس چکی ہے

وہاں کسی سے مقررہ وقت پر ملاقات
یا اکٹھے کوئی بھی ساعت گزارنا
اب محال ہے!

اور وہ نثری نظموں کی طرح بے نظمی جی رہے ہیں
اور اب وہ اپنا جواز گھڑنے سے تھک گئے ہیں
سو وہ توازن کی کھوج میں ہیں
کہ اب یہ (chaos) ان کی خاطر ڈراونا خواب بن چکا ہے!

کہ جیسے یہ خواب۔۔

کوئی لوہے کا دیوہیکل مرے تعاقب میں گرز تھامے، چنگھاڑتا ہے
میں گرتا پڑتا عجیب گلیوں میں بھاگتا ہوں
وہ گرز سے اردگرد دیواریں توڑتا، چیختا ہوا
ہر طرف نمودار ہو رہا ہے
اچانک ایسا دکھائی دیتا ہے
جیسے رستہ نہیں رہا اور لوہے کا ہاتھ
مجھ کو فوراً دبوچ لے گا
اور آنکھ اچانک ہی تیز دھک دھک سے جاگتی ہے
(یہ سلسلہ وار خواب ہے)

سو وہ لوہے کے دیو (chaos) اور تباہی مچاتے گرزوں سمیت
اس سمت آ رہے ہیں!
سنو! اے خوابوں سے بھاگتے، خوف کھاتے لوگو!
سنو! اے بدانتظامیوں پر جلاؤ گھیراؤ کرتے چہرو!
سنو! اے نظموں کو نثر کرتے ہوئے دماغو!

وہ ایلین ہم سے نظم لینے کو آ رہے ہیں!

اسامہ رضوان

”زینب“

مرض اب تو اک اور سر اٹھانے لگا
درندہ میرے شہر کے پھول اٹھانے لگا

کلی نے بے دم سی آہ یہ بھری تھی
میں تو اپنے آنگن کی معصوم کلی تھی

مسلنے سے پہلے ذرا خیال کیا ہوتا
قہرِ خداوندی کا ذرا سوچ لیا ہوتا

روشنی کرنی تھی جس چراغ نے گلستان میں
چھوڑ آئے ہیں اہلِ چمن اسے گورستان میں

خواب میں آکے وہ دھیمے سے بولی
بابا میں اس رات بے تحاشا رولی

راز احتشام

غزل

لوٹ آئے ہیں خاک چھان کے بھی
کیا ملا دل کی بات مان کے بھی؟

ان ستاروں کو خواہ مخواہ نہ سمجھ
زخم ہوتے ہیں آسمان کے بھی!

اپنے بس میں ہوا رہی جب تک
ہم مخالف تھے بادبان کے بھی

زندگی وہ لباس ہے جو ہمیں
پورا آیا نہ کھینچ تان کے بھی!

جا چکے بدگمانیوں کے سبب
دوست کچھ وادیِ گمان کے بھی

راز احتشام

غزل

جو کوہ قافِ غزل کی پری نہ لے جائے
محال ہے کہ کوئی بھی خزینہ لے جائے

ہم ایسے بھٹکے ہوؤں کو یہ خوف رہتا ہے
یہ گمرہی بھی تری سمت ہی نہ لے جائے

ہم ایک موج میں آئے ہوئے ہیں مدت سے
ہمارا کیا ہے ، جہاں بھی سفینہ لے جائے

اس ایک شخص کا اتنا بھی غم نہیں کرنا
وہ ایک پھول کہیں باغ ہی نہ لے جائے

میں اپنے کمرے کے ملبے تلے نہ دب جاؤں
یہ میرا ڈر ہی مری زندگی نہ لے جائے

اسے میں پیار سے سمجھانا چاہتا ہوں مگر
وہ میری بات کہیں اور ہی نہ لے جائے

تری تلاش میں جن وادیوں سے ہم گزرے
خدا وہاں کسی دشمن کو بھی نہ لے جائے

روحان حسین

غزل

کچھ خوابوں کا بہکایا ہوا ہوں
میں تیرے عشق میں ضائع ہوا ہوں

خدا و خلق میرے معترف تھے
اب دونوں کا ٹھکرایا ہوا ہوں

کہا اک شعر نے اِترا کے مجھ سے
کہ میں غالبؔ کا فرمایا ہوا ہوں

پناہ ملتی نہیں اپنے بھی دل میں
میں ایسے در کا ٹھکرایا ہوا ہوں

مجھے کم گوئی کی عادت نہیں ہے
میں بس دنیا سے اکتایا ہوا ہوں

مجھے اب لوگ کہنے لگے ہیں
میں کچھ دن سے مرجھایا ہوا ہوں

تری خوشیاں مرے ذمے ہیں جب سے
اس دن سے گھبرایا ہوا ہوں

اسامہ رضوان

غزل

گویا نہ ہوئے وہ جو چند دنوں سے
ادنیٰ گردانتے ہیں ہم خود کو مروں سے

داستانِ شب سنا رہی ہیں آنکھیں تمھاری
چپ کیوں ہو بول بھی دو لبوں سے

بہ راستہ چشم بہہ گیا سب لہو ہمارا
دوڑتا فقط اب درد ہے ان رگوں سے

خفگی کے بعد ملاقات جو ہوئی اچانک
روٹھ گئے یک لخت ہم، سب گِلوں سے

چار دن کی دیوانگی کا ثمر ملا یہ
ہو گئے بیگانے ہم اپنے سگوں سے

مانند شیر ہیں زبان سے یہ لوگ مسحورؔ
نفق جاتا نہیں خواہ ہو جائیں تن جدا سروں سے

زاہد حسن

''حلقۂ دانش'' اور ''احمد بلال اعوان بزمِ ادب'' تقاریب

''حلقۂ دانش''اور ''احمد بلال اعوان بزمِ ادب'' کے زیرِ اہتمام اہم تقاریب کا اہتمام

لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (لمز) اپنے طلبہ میں اردو اور دیگر قومی زبانوں کی محبت اجاگر کرنے کے لیے گاہے بہ گاہے علمی، ادبی اور تہذیبی موضوعات پر تقریبات کا اہتمام کرتی ہے۔ اس سلسلے میں نہ صرف یہ کہ ''حلقۂ دانش''اور ''احمد بلال اعوان بزمِ ادب'' کے زیرِ اہتمام تقاریب کا اہتمام کیا جاتا ہے بلکہ سُرسنگیت کے حوالے سے بھی اہم محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔

اس بار ''حلقۂ دانش'' کو ''شاعری کے سفیر......ترجمہ اور تخلیق'' کا خاص عنوان دیا گیا جس میں صاحبِ اسلوب شاعر، مترجم اور استاذ الادب افضال احمد سیّد کے کیے گئے تراجم بادۂ دوشینہ جو کہ مرزا عبدالقادر بیدلؔ کے منتخب اشعار اور غزلوں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کو اپنی اشاعت کے ساتھ ہی بے حد پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور جس منفرد اور خوب صورت طریقہ سے انھوں نے ترجمہ کیا ہے اس کے دوسری مثال کم ہی ملتی ہے۔ جنوبی ایشیا میں فارسی زبان و ادب اور خاص طور پر شاعری میں بیدلؔ جیسا دوسرا شاعر ملنا ناممکن ہے۔ بیدلؔ کے جس شاعر پر گہرے اثرات مرتب ہوئے وہ اردو اور فارسی کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ ہیں۔ خاص طور پر غالب کی اردو شاعری پر بیدل کی فارسی شاعری کے گہرے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی میں فارسی شاعری میں موضوعاتی، لسانی اور اسلوبیاتی سطح پر جس شاعر نے فارسی شاعری کو اعلیٰ و ارفع مقام تک پہنچایا یقیناً وہ بیدل ہی ہیں۔ زندگی اور زندگی کے معاملات میں سے فطرت اور اس کے رنگوں کو تمام تر جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ محققین کے مطابق ان کے سولہ شعری مجموعے ملتے ہیں جن میں کل ایک لاکھ پینتالیس اشعار ہیں۔ جن اشعار کے

تراجم افضال احمد سیّد نے کیے ہیں ان میں سے بعض کے تراجم انھوں نے تقریب میں پڑھ کر سنائے، سننے والوں نے بہت لطف اٹھایا اور یوں محسوس ہوا کہ جیسے بیدلؔ ہم عصر شاعر ہیں اور موجودہ عہد کے معاملات کو ہمارے سامنے اپنے تمام تر حُسن اور خوب صورتی کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

افضال احمد سیّد بہ ذاتِ خود بہت عمدہ شاعر اور مترجم ہیں۔ جدید اردو نظم میں ان کا نام اور کام منفرد شناخت کا حامل ہے۔ وہ کراچی کی ایک یونیورسٹی میں کلاسیکی اردو شاعری پڑھاتے ہیں۔ انھوں نے سوال جواب کے دوران بتایا کہ یونیورسٹی میں تدریس کے دوران محسوس کیا کہ ان کے طلبہ کو اشعار سمجھنے میں بہت مشکل پیش آتی تھی۔ لہٰذا یہ سلسلہ اسی خیال کے تحت سامنے آیا۔ پہلے انھوں نے میرؔ کے کلام کا ترجمہ کیا۔ اسے پذیرائی ملی تو پھر یہ کام سامنے آیا۔ اس سوال کے جواب میں کہ اس کام کے دوران انھیں کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ان کا کہنا تھا کہ چوں کہ فارسی زبان وادب کی روایت ہمارے ہاں بہت قدیم ہے۔ اردو شعروادب کے بہت سے مآخذ خاص طور پر شاعری میں تشبیہات، استعارات اور اسلوب و بیان کی سطح پر زیادہ تر الفاظ فارسی سے ہی ہمارے ہاں آئے ہیں تو ضروری ہے کہ اس زبان سے اپنا تعلقِ خاطر قائم رکھا جائے۔ یہ اس صورت میں ہی برقرار رہ سکتا ہے کہ فارسی شعرا کے اردو میں زیادہ سے زیادہ تراجم کیے جائیں خاص طور پر ان شعرا کے تراجم کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے جنھوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی اظہارِ خیال کیا۔ تقریب کے اختتام پر لمز کے معروف خطاط شیر زمان صاحب کی بیدلؔ کے اشعار کی خطاطی پیش کی گئی۔

دوسرے حصے میں محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں غلام حسین ساجد، معین نظامی، ضیاالحسن، حمیدہ شاہین، سعدیہ بشیر، فیصل ہاشمی، احمد عطا، محمد علی، احتشام علی، محمد احمد، انجم قریشی، راقم (زاہد حسن) اور دیگر احباب نے اپنا کلام پیش کیا جسے بے حد سراہا گیا۔ تقریب میں یونیورسٹی کے طلبہ کے علاوہ اساتذہ نے بھی شرکت کی جن میں کامران اصدر علی، بلال تنویر، مریم واصف خاں، علی رضا، محمود الحسن، رانا محمد آصف اور دیگر شریک تھے۔

محفل شعروادب اور موسیقی

شعروادب اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ '' شُدھ سُر'' کے عنوان سے لمز میں استاد نصیر الدین سامی کے ساتھ خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ استاد سامی سے بات چیت علی سیٹھی نے کی۔ پروگرام کے آغاز میں ڈائریکٹر گرمانی مرکزِ زبان وادب بلال تنویر نے سب کا شکریہ ادا کیا اور خوش آمدید کہا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ استاد نصیر الدین سامی ہمارے عہد اور برِ صغیر کی بڑی ہستیوں میں سے ہیں۔ موسیقی کو جاننے والے دنیا بھر میں سامی صاحب کا گانا جانتے ہیں۔ پچھلے سال ملائشیا میں ایک کانفرنس کے دوران میری ملاقات ایک ملیالم کی شاعرہ سے ہوئی جو بنگلور میں مقیم تھیں۔ جب میں نے انھیں لاہور آنے کی دعوت دی تو انھوں نے کہا کہ وہ پاکستان آنے میں صرف اس لیے دل چسپی رکھتی ہیں کہ وہ سامی صاحب کا گانا سن سکیں۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ اگر وہ دن آیا کہ وہ سرحد پار آئیں تو میں ان کی سامی صاحب سے ملاقات کراؤں گا۔

بلال تنویر نے مزید کہا کہ حاضرین میں سے جن کا سامی صاحب کی محفل میں بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا، ان سے گزارش ہے کہ اگر اپنا گیان اور دھیان یک جا کر کے ایک گھنٹے کے لیے متوجہ ہوں تا کہ وہ اپنے ساتھ ایک انوکھا تجربہ اور تحفہ لے کر جائیں، ایک ایسا تحفہ جو نہ صرف ان کے لیے یادگار رہوگا بلکہ ان کا موسیقی کی طرف رجحان ہی بدل دے گا۔ سامی صاحب کا مکمل تعارف ان کی موسیقی ہے لیکن اس کا کچھ ذمہ علی سیٹھی کے کاندھوں پر ہے۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ آج کی شام علی کی مرہونِ منت ہے۔ علی نے اپنی محنت سے جو مقام اور مقبولیت حاصل کی ہے وہ اس کو اپنا منصب نہیں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ اگر آپ کبھی علی کے کسی کانسرٹ میں گئے ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ علی صرف گاتا نہیں بلکہ سکھاتا بھی ہے۔ علی سکھاتا شاید اس لیے ہے کہ جو کچھ اس نے اپنے عشق کے مکتب سے پایا ہے وہ دوسروں تک بھی پہنچے۔ اسے اس بات کا احساس شدت سے ہے کہ یہ کلاسیکی میراث جس کا ایک مظہر آج آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا وہ تب ہی سنبھل سکتی ہے جب ہم سب اس میں شامل ہوں۔

مجموعی طور پر یہ پروگرام شعروادب کا اور فنِ موسیقی کا حسین مرقّع تھا جس میں طلبہ اور لاہور بھر سے شائقین کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

کلیاتِ فیض کی تقریب رونمائی

فیض احمد فیض اردو زبان کے منفرد اور صاحبِ اسلوب شاعر ہی نہیں وہ عصرِ حاضر کے اہم پاکستانی دانش ور کے طور پر بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری اور مضامین میں مزاحمتی رنگ نمایاں رہا۔ وہ آج بھی آمرانہ اور سامراجی قوتوں کے خلاف مزاحمت اور آزادی کے استعارے کے طور پر ہمارے شعری اور ادبی منظر نامے پر جگمگاتے دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی میں انھوں نے کئی طرح کے کام کیے اور پیشے اختیار کیے۔ مثال کے طور پر وہ مختلف کالجوں میں پڑھاتے رہے۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ مختلف موضوعات پر مضامین بھی لکھے۔ اخبارات اور رسائل وجرائد میں بہ طور صحافی کام بھی کیا اور اپنے بیروت قیام کے دوران مشہور زمانہ جریدے لوٹس کے مدیر بھی رہے۔ ان کی شاعری، زندگی اور فکر پاکستان کی علمی، ادبی اور تہذیبی صورت گری کرتی رہی۔ فیض صاحب کے حوالے سے ایک مختلف نوعیت کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ یہ تھا کلیاتِ فیض کی تدوین اور اس کی اشاعت کے حوالے تقریب کا اہتمام۔ کلیاتِ فیض کو نام ور مترجم، مدیر، استاد اور دانش ور سید نعمان الحق نے مدوّن کیا ہے۔ اس پر انھوں نے کئی برس کام کیا۔ اب تک فیض صاحب کی شاعری کے شائع ہونے والے تمام تر مجموعہ ہائے شعر کو علیحدہ علیحدہ اور یک جا شائع ہونے والے ہر طرح کے کام کو انھوں نے ڈھونڈا، پڑھا، دیکھا اور پرکھا۔ ان چھوٹی موٹی اغلاط کو عمدگی کے ساتھ ختم کر دیا جو پہلی اشاعت کے بعد مسلسل نئی اشاعتوں کا حصہ بھی بنتی چلی جارہی تھیں۔ ان سب باتوں کا اظہار سید نعمان الحق نے لمز میں حلقۂ دانش کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی اس تقریب میں کیا جس کی نظامت کے فرائض بلال تنویر نے سرانجام دیئے۔ کلیات فیض کے حوالے سے عامر مفتی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سید نعمان الحق کی زندگی کا زیادہ تر عرصہ تعلیم وتدریس میں گزرا ہے۔ وہ امریکہ سمیت پاکستان کی لاہور اور کراچی میں موجود مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھاتے رہے ہیں۔ پڑھانے کے اس عمل کے دوران ہی جب انھیں فیض صاحب سمیت اردو اور فارسی کے بے شمار شعرا کو پڑھانا پڑتا ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ وہ جو کتابیں خود پڑھتے ہیں اور اپنے طلبہ کو پڑھنے کے لیے جن کتابوں کا حوالہ دیتے ان میں چھوٹی یا بڑی نوعیت کی بے شمار اغلاط سامنے آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کچھ کتابیں ایڈٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور کلیاتِ فیض بھی دراصل اسی سلسلے کی ایک کڑی

ہے۔اُمید ہے کہ فیض صاحب سے محبت کرنے والوں اوران کے پڑھنے والوں کے لیے یہ بہت اہم نسخہ ثابت ہوگا۔

تقریب کے دوسرے مہمان عامر مفتی۔ان کا کہنا تھا کہ کم ازکم سات سوصفحات پر مشتمل کلیاتِ فیض کی یہ تدوین سید نعمان الحق کا بہت بڑااوراہم کام ہے۔حقیقت یہ ہے کہ فیض صاحب سے محبت کرنے والوں اورانھیں پڑھنے والوں کا ہمیشہ ایک خاص حلقہ ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں قابلِ قدر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔عامر مفتی خود امریکا کی ایک یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ ساتھ باہر کی دنیا کے پڑھنے والوں کے لیے بھی فیض صاحب کے ان کلیات کی اپنی اہمیت ہے۔ہمیں اپنے شاعری کے کئی کورسز میں بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔پاکستان کو شعری تناظر میں سمجھنے اور جانچنے کے لیے ایسے مستند اور جامع مجموعوں کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔میں سید نعمان الحق کو اتنا اہم کام انجام دینے اور پھر اس کی اشاعت پر دلی مبارک پیش کرتا ہوں۔

اس تقریب میں طلبہ کی کثیر تعداد کے ساتھ کامران اصدر علی، ندا کرمانی، مریم واصف خان، عزا حسین، عدیل ہاشمی، ماہ نور لون، محمد احمد اور وجاہت بیگ نے شرکت کی۔

پروین ملک کے ساتھ ایک نشست

جنوبی ایشیائی خطّے کے کسی بھی لکھنے والے کے حصّے میں وہ اعزاز نہیں آیا جو ساٹھ سالہ ادیبہ ارون دھتی رائے کے حصے میں آیا ہے۔ ۲۴ نومبر ۱۹۶۱ء کو شیلانگ (انڈیا) میں پیدا ہونے والی ارون دھتی رائے کے اب تک دو ناول اور مضامین پر مشتمل تین کتب سامنے آ چکی ہیں۔حال ہی میں آنے والے ان کے نئے ناول ''*The Ministry of Utmost Happiness*'' نے انھیں پھر سے دنیا کے اہم ترین لکھنے والوں کے دھارے میں لا کھڑا کیا ہے۔دہلی اور کشمیر سمیت انسانی معاملات کو بیان کرنے والے اس ناول کا ترجمہ بھی اردو دنیا تک پہنچ چکا ہے۔اردو روپ ارجمند آرا نے دیا۔ان کا پہلا ناول ''*The God of Small Things*'' ہے۔ان کا یہ ناول آج تک اُسی طرح پڑھا اور اسی طرح اس پر بات چیت بھی ہوتی ہے جس طرح اُس کے چھپنے کے فوری بعد ہوئی تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ خود ناول کا عمدہ ہونا تھا۔دوسرا اس نیم بائیوگرافیکل ناول پر اُسی برس ادب کا بہت بڑا ایوارڈ ''بکر پرائز'' کا ملنا بھی تھا۔حقیقت یہ ہے کہ اس ایوارڈ کے ملنے کے ساتھ ہی اُن کا نام پوری دنیا میں گونجنے لگا۔

انگریزی میں تو اس ناول کے تھوڑے سے عرصے میں ہی کئی ایک ایڈیشن چھپے۔ برصغیر کی دیگر زبانوں میں بھی اس کے دھڑا دھڑ تراجم ہونے لگے۔ اُردو میں ایک برس بعد ہی اس کا ترجمہ سامنے آ گیا۔ یہ ترجمہ پنجابی اور اردو کی مشہور کہانی کار، کالم کار اور مترجم پروین ملک نے کیا جو 'سارنگ پبلی کیشنز، لاہور' کے توسط سے چھپ کر سامنے آیا۔ اس ناول کا دوسرا ایڈیشن اب چھپ کر سامنے آیا ہے جس پر 'فکشن کے سفیر' کے عنوان سے لمز کے زیر اہتمام ایک مکالمے کا اہتمام کیا گیا۔ احمد بلال اعوان بزمِ ادب کے زیرِ اہتمام ہونے والے اس مکالمے میں نظامت کے فرائض ضیاالحسن نے سرانجام دیے اور بہ طور مہمان پروین ملک شریک ہوئیں۔ نشست میں شعرا و ادبا کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے طلبہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ پروین ملک نے اپنی گفتگو میں بتایا کہ اگر چہ وہ بنیادی طور پر پنجابی زبان کی ادیبہ ہیں تاہم انھوں نے آدھی عورت کے نام سے اردو میں بھی ایک ناولٹ لکھ رکھا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے قرۃ العین حیدر کے بعض طویل افسانوں کے علاوہ بعض دیگر اہم لکھنے والوں کے افسانے بھی پنجابی میں ترجمہ کر رکھے ہیں۔ لیکن جو لطف اور دلچسپی ارون دھتی رائے کے ناول کے ترجمہ کے دوران پیدا ہوئی وہ آخری وقت تک برقرار رہی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس تجربے نے خود ان کے لکھنے کے عمل پر بھی مثبت اثرات مرتب کیے اور سچی بات یہ ہے کہ ایک اچھے، اہم اور بڑے لکھنے والے کا ترجمہ بہ ذاتِ خود کسی اچھے استاد ہی کی طرح رہ نمائی بھی کرتا ہے۔ پروین ملک نے کہا کہ میرے لیے زندگی میں کئی خواتین تحریک کا باعث بنی ہیں۔ مَیں پنجاب کے ایک دور دراز قصبے شین باغ (اٹک) میں پیدا ہوئی جہاں تعلیم کا حاصل کرنا اور آگے بڑھنا دور از قیاس تصور کیا جاتا ہے۔ مَیں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتی ہوں کہ مجھے پڑھے لکھے والدین ملے جو علم کی طاقت پر یقین رکھتے تھے۔ پھر زندگی میں ایسی تحریروں نے بھی بہت اثرات چھوڑے جیسی تحریر ارون دھتی رائے کی ہے۔

تقریب میں بلال تنویر، محمد احمد، رضا نعیم، فاطمہ فیاض، معین نظامی، وجاہت بیگ، فرحان سلیم اور دیگر احباب نے بھی شرکت کی۔ آخر میں بعض طلبہ نے ترجمے کے عمل اور ترجمے کے دوران درپیش آنے والی مشکلات کے حوالے سے سوالات بھی کیے۔

Annual Students' Magazine

NUMŪD

Volume 9, 2020

LUMS
A Not-for-Profit University
Gurmani Centre for Languages and Literature
Lahore University of Management Sciences
Opp. Sector U, DHA, Lahore Cantt. 54792, Pakistan.
Ph: +92 42 3560 8000 - Ext.: 2224

Annual Students' Magazine

NUMŪD

Volume 9, 2020

LUMS
A Not-for-Profit University
Gurmani Centre for Languages and Literature